

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226408

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ دارالمصنفین
نمبر

برکے کلمے

اول

جس میں برکے کی کج سوانح، اس کی فلسفیانہ تصنیفات کی ناقدانہ تلخیص،
اور اس کے ”فلسفہ تصویریت“ کی تشریح و تنقید ہے،

از

اسٹنٹ پروفیسر عبدالباری ندوی

باتھام مولوی مسعود علی ندوی

در مطبع ہمارے، عظیم گڑھ چاپ ہند

۱۹۱۹ء

انتساب

میری انگریزی کی تحصیل بہت کچھ میرے محترم بزرگ
خان بہاؤ شاخ مقبول حسین سی، آئی، اسی تعلقدار گدیہ
کی رہین کرم ہے۔ لہذا منت پذیری کا تقاضا، اس زبان
کا سب سے پہلا استفادہ نذرین پیش کرتا ہوں،
مگر بعین غنایت قبول فرماید

”عبدالباری“

فہرست مضامین

دیباچہ

۱- ر

سوانح

۲- ۱

تہذیب

برکھے کو آئرش فلسفی کہنا درست نہیں، غار ڈنور۔ پھانسی کی

۱۳- ۲

آزمائش۔ کتاب تعلیمات۔ ذہنی زندگی کا ماٹو۔

عہد عمل ”جدید نظریہ رویت“ ”مبادی“ کے ساتھ معاصرین کی بے اعتنائی۔

برکھے کی ذات میں مذہب و فلسفہ کا دوش بدوش اجتماع۔ تدریسی اور

کلیسائی خدمت۔ اطاعت غیر مقادمانہ پر وعظ۔ سفر و سیاحت۔ آزاد

خیالوں کے خلاف گارجین میں مضامین۔ مکالمات ہائلس کی شاعت۔

فرانس داہلی کا سفر۔ روزنامہ سیاحت۔ نظر کی ہمہ گیری۔ وٹیکن

لائبریری کی سیر۔ بحر جنوبی کا فتنہ۔ بے سان گمان دولت۔ جزائر

برمودا میں کالج قائم کرنے کی اسکیم۔ جزیرہ رہوڈ۔ دہائٹ ہال۔

۴۳- ۱۳

لندن واپس۔ آرزوئے عزت۔ منصب بٹپ۔

عہد عزت خدمت وطن۔ لائڈہی کی روک تھام۔ اقتصادی اصلاحات۔

”مستفسر“۔ ”مقالہ بنام حکام“۔ انسان کے اعمال اسکے خیالات کا

نیچے ہوتے ہیں۔ ایک دقیق بحث۔ سوت کا کارخانہ۔ ماہ القیر کے
معلق طبی تحقیقات۔ قناعت و خود داری۔ اولاد کی تعلیم

۵۷ - ۴۳

و تربیت - موت -

تصنیفات

۷۲ - ۵۹

۱۔ ”جدید نظریہ ریت“

۸۲ - ۷۲

۲۔ ”مبادی علم انسانی“

۸۴ - ۸۲

۳۔ ”مکالمات مابین ہائلس و فلوش“

۸۵ - ۸۴

۴۔ ”ڈیپاٹو“

۹۱ - ۸۶

۵۔ ”مکالمات السیفارن“

۹۲ - ۹۱

۶۔ ”سیرس“

برکے کا فلسفہ تصوریت،

فلسفہ کی حقیقت و مذاہب - فلسفہ تصوریت - پروڈاگورس

ڈیکارٹ، اور لاک کے نظریات - فلسفہ برکے کی تشریح

۱۱۳ - ۹۳

اور تنقید -

۱۱۶ - ۱۱۴

عام تبصرہ

۱۲۴ - ۱۱۷

ضمیمہ تصورات کلیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

انگریزی بدنام ہے کہ اُسے لفظ فلسفہ کا استعمال نہایت ہی سست اور پامال کر دیا ہے۔ اُردو پر بھی انگریزی ہی کا سایہ پڑا ہے، اور فلسفہ کا لفظ ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے، کہ اصلی اور صحیح معنی (مابعد الطبیعیات) میں اُردو، کمنا چاہیے، کہ ابھی فلسفہ کی ابجد سے بھی نا آشنا ہے۔ اور کسی حلیل القدر مذہب فلسفہ کے بانی کا کوئی مکمل کلاسکل کا زمانہ تو قطعاً ہماری زبان میں موجود نہیں۔ اس لحاظ سے ”مبادی علم انسانی“ (جو پچھلے سال ”دار المصنفین“ سے شائع ہو چکی ہے) اُردو میں فلسفہ جدیدہ کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ یہ اگرچہ کینیٹ اور ہگیل وغیرہ کے سنگم کاخ مصنفات کے دیکھتے ہوئے پانی ہے تاہم چونکہ مباحث فلسفہ میں مابعد الطبیعیات کی بحثیں قدر تا زیادہ غیر الفہم، مجرد، اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ایسے متعلین فلسفہ کے دائرہ، اور اعلیٰ درگاہوں کے احاطہ سے باہر بہت کم لوگ مبادی سے پوری طرح متبع ہو سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسی کتابیں زیادہ تر درس و تدریس ہی کے کام آسکتی ہیں۔ چنانچہ یہ خود اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب فلسفہ میں داخل رہی اور رہتی ہے۔

ان افکار عالیہ کی اشاعت کو وسیع تر بنانے کے لیے اگر کوئی صورت ہی، تو صرف یہ کہ اُن کو تا بہ امکان سہل اور صاف پیرائیہ ادا میں ڈھال کر مصنف کے دلچسپ احوال زندگی

وغیرہ کی لپیٹ میں بیان کر دیا جائے، جس سے تلخکامی کا احساس نسبتاً کم ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں ”بلیک وڈس فلو سا فلی کلاسکس“ وغیرہ مختلف سلسلوں سے بہت کچھ اسی مقصد کی خدمت گذاری ہوتی ہے۔ پیشکش مجموعہ کی بھی ایک بڑی غرض یہی ہے۔ اس میں (۱) برکے کی سوانح (۲) اسکی فلسفیانہ تصانیف کا ملخص۔ اور (۳) اس کا فلسفہ تصویریت شامل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی نسبت چند باتیں کہنی ہیں :

سوانح [شبلی اکا ڈمی] کے سید الطائفہ کا اعتراض ہے کہ ”تین سوانح سے اتنے صفحات کیون رٹک ڈالے؟ ہکو برکے کے خیالات سے مطلب ہے، اس کے حالات سے کیا سروکار؟“ سٹریبن (پرنسپل دکن کالج) سے ایک روز گفتگو آئی تو کہا کہ ”برکے کی زندگی تو نہایت دلکش ہے۔ لیکن اسکا فلسفہ سترتا سر بے معنی ہے۔“ ہمارے نزدیک، ”دیار ماین دار دو آن نیریم“ برکے کی سب سے پہلے قابل استناد لائف اسکی وفات سے ۲۳-۲۴ سال بعد ۱۸۷۶ء

میں اشاک نامی ایک بٹپ نے لکھی جو نہایت مختصر اور ناتمام ہو۔ لیکن سو برس تک کہنا چاہیے کہ اسی کے چند واقعات کا الٹ پھیر کر، یورپ بھر میں اعادہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد پروفیسر فریڈر نے جاکر اس بے اعتنائی کے ننگ کو دھویا، جو اٹھارھویں صدی کے ایک فیلوف اعظم کے حالات زندگی کے ساتھ برتی جا رہی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اُسے حق ادا کر دیا۔ تقریباً سو سو سال کے امتداد ایام کی دست برد سے جو کچھ بچا تھا، اس کے ایک ایک ذرہ کو انتہائی کاوش و تحقیق سے یکجا کر کے ۱۸۷۶ء میں ”سوانح و مکاتیب برکے“ کے نام سے ساڑھے پانچ سو سے زائد صفحات

۱۷۱۱ء فریڈرک کیسل فریڈر (۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۱ء) کا خود فلسفہ کے ممتاز رجال میں شمار ہے۔ اپنے مشہور استاد سر ولیم ہملٹن کے بعد ”اؤنبرا یونیورسٹی“ میں منطق و مابعد الطبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت سے اس کا جانشین قرار پایا۔ برکے کا تو وہ پورا پورا متعلم ہی ہے۔ باقی لاک وغیرہ بھی اس کے فلم کے منت کش ہیں۔ خود اپنی لائف نہایت دلچسپ لکھی ہے۔

کے ضخیم جلد میں شائع کیا۔ اسی کے ساتھ تین جلدوں میں تمام نوشتجات بھی نہایت سلیقہ سے تین عوامات کے تحت میں مرتب کر کے چھاپ دیے۔ "سوانح و مکاتیب" والی جلد میں برکھ کی چند پرائیویٹ غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں، جو سوانح نگار کے لیے نہایت قیمتی مواد ہیں۔

تھوڑے دن بعد کچھ اور ذخیرہ ہاتھ آیا جس میں سر جان پرسپول کے نام کے خطوط خاص مسمت رکھتے ہیں۔ اس جدید سرمایہ معلومات کو سامنے رکھ کر ۱۹۷۷ء میں پھر قریباً ڈھائی سو صفحے کی ایک کتاب برکھ لکھ ڈالی۔ جس میں پرسپول کی مراسلتہ کے اقتباسات جا بجا درج ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں مجموعہ نوشتجات اور مکاتیب "سوانح" کا دوسرا ایڈیشن بہت کچھ اضافہ کے ساتھ نکلا۔ اور اب جو کچھ برکھ کے کوائف حیات سے متعلق لکھا جاتا ہے وہ تامل فری زری کے خرمن کی خوشہ بینیاں ہوتی ہیں۔

اس بنا پر ۱۹۷۷ء کے بعد برکھ کا کوئی سوانح نگار اگر فری زری کے سو کسی اور کا نام لے تو یہ قطعاً اسکی حق ناشناسی یا پھر اپنی وسیع النظری کا خواہ مخواہ دکھلاوا ہو گا۔ درنہ انصاف یہ ہے کہ ایک قطرہ بھی اس سمندر سے باہر نہیں ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ۶-۷، سو صفحات کو ۷۰ صفحے میں پنچوڑ لیا ہے تفصیل سے اجمال پر قناعت کی۔ اُن باتوں کو کٹیٹھ چھوڑ دیا ہے جو برکھ سے بالذات یا قریبی علاقہ نہیں رکھتیں۔ مکاتیب کے صرف با محل اور جستہ جستہ اقتباسات پر بس کیا ہے۔ پھر بھی اس امر کا پورا اہتمام رکھا گیا ہے کہ کوئی ایسا جزئی سے جزئی واقعہ بھی نہ چھوٹنے پائے جس سے زندگی کے کسی سُنچ پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہو۔ اسکی خاطر بعض غیر دلچسپ اور مُمل باتیں بھی آگئی ہیں۔ لیکن جو خط و خال بھی چہرہ پر دکھلائی پڑے ہیں۔ انکو اتنا اجاگر کر دیا گیا ہے کہ مقدور بھر کامل نقشہ سامنے آجائے چونکہ ہم نے تمام مواد خود پڑھ کر براہ راست استعمال کیا ہے اسیلے قدرتی طور پر اخذ و استنباط میں کمین کمین پر و فیہ موصوف سے اختلاف ہو گیا ہے۔ واقعات کی ترتیب و تبویب میں بہت کافی فرق ہے۔ جو لوگ فلسفہ سے ذوق بھی نہیں رکھتے امید ہے کہ اُن کے لیے سوانح کا حصہ

کچھ نہ کچھ دھچپ اور بہت کچھ سبق آموز ہوگا۔

ہمارے سید فاضل، جو سوانح کو سرے سے غیر ضروری یا ۵۰ صفحے سے زائد اسکی نذر کر دینا بجا خیال فرماتے تھے۔ انکی اتنی نظر تو لگ ہی گئی کہ کاتب صاحب نے پورا ایک ٹلٹ مسودہ غائب کر دیا۔ گم شدہ مسودہ کو از سر نو دوبارہ لکھنا۔ جسدرجہ ناگوار اور تلخ تجربہ ہے اس کا حال اس تلخکامی کے کسی تجربہ کار ہی سے پوچھو۔ طبیعت پر بیحد جبر کر کے بُری بھلی طرح اس بوجھ کو اتارنا پڑا۔ جسکا فقط اتنا ہی وبال نہیں پڑا کہ دو چار صفحے اور گھٹ گئے، بلکہ واقعات کے ایک گونہ باہمی عدم تناسب اور ناہمواری بیان وغیرہ کے بھی بعض نقائص پیدا ہو گئے۔

تصنیفات | اس عنوان میں صرف وہی کتابیں لی گئی ہیں جنکو کچھ نہ کچھ فلسفیانہ افکار و بحث سے تعلق ہے۔ اور کسی قدر ناقذانہ حیثیت سے اُن کے مہمات مطالب کی تلخیص کر دی گئی ہے۔ جدید نظریہٴ ردیت کا ذرا تفصیل سے ذکر ہے کہ وہ بجائے خود علم النفس و علم المرایا کے ایک عظیم الشان اکتشاف و تحقیق پر مشتمل ہونے کے علاوہ مبادی کے اصل فلسفہ کا مقدمہ اولے یا صفر ہے۔ خود مبادی علم انسانی کے دعویٰ کو بھی اختصار کی رعایت کے ساتھ جہانک بن پڑا ہے، زیادہ واضح اور سہل تر اسلوب سے بیان کر دیا گیا ہے کہ عامی آدمی بھی تھوڑا بہت بہرہ اندوز ہو سکے۔

پروفیسر فریزر نے اس میدان میں بھی اپنی قابلیت اور محنت کی داد دی ہے۔ یعنی ہر تصنیف پر ایک بسیط اور مفید دیباچہ لکھا ہے۔ مباحث کتاب کا خلاصہ بھی دیدیا ہے۔ لیکن اس بارے میں ہم براے نام ہی کسی دوسرے کے رہیں ہیں۔ کیونکہ ہم نے خود برکے کے مصنفات کا کہنا چاہیے کہ ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

فلسفہٴ تصوریت | کتاب کا یہ حصہ ارباب ذوق کی نظر اور غائر نظر کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ ابتدائیں

فلسفہ برکھ کی مخصوص نوعیت اور اس کے ارتقائے تاریخی کی چند موٹی موٹی کڑیوں کا ذکر ہے پھر تشریح و تنقید ہے۔

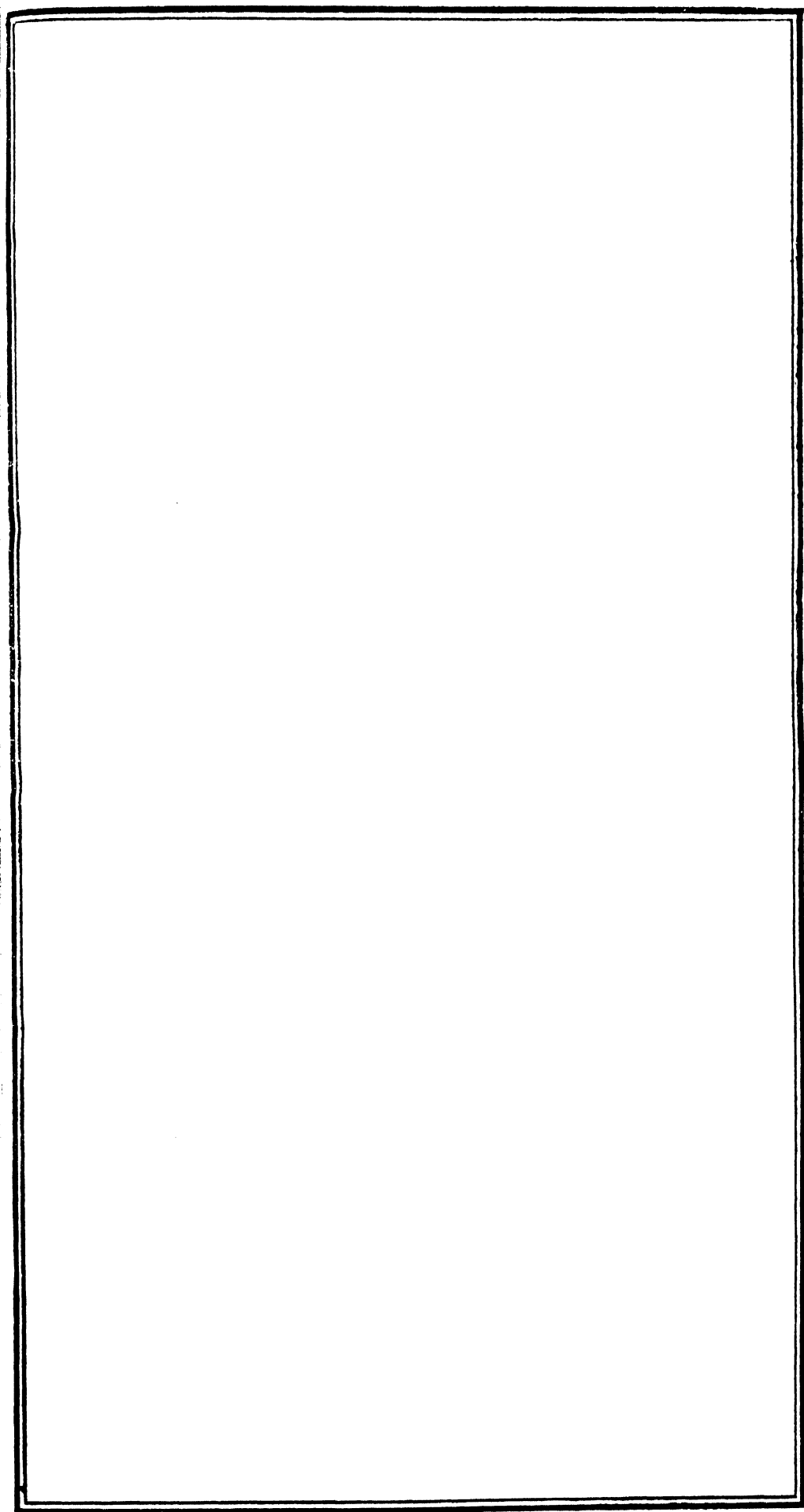
اس ذیل میں صرف اتنی بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ برکھ کے اصل نظریہ اور دعویٰ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے دلائل کا کلیۃً التزام نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اختصار کی خصوصیت کے ساتھ زیادہ ذہن نشین ترتیب مقدمات اور زیادہ سیر الفہم پیرایہ بیان میں تشریح کی کوشش کی گئی ہے۔ تنقید میں وجوہ خدا کے دلائل کی جو کچھ تضعیف کی گئی ہے اُس سے فلسفہ تصوریّت کی کمزوریوں کا اظہار مقصود ہے۔

اخیر میں مجکو اپنے فاضل اور مکرم دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر ایم۔ اے فیلو بمبئی یونیورسٹی کا بالخصوص شکریہ ادا کرنا ہے۔ ان کی بدولت نہ صرف بمبئی کے کتب خانوں سے بہ وقت ضرورت تمتع اٹھاتا رہا ہوں۔ بلکہ برکھ اور مبادی علم انسانی دونوں پر نظر ثانی انہی کے علم کدہ پر ہوئی ہے۔ بعض وقت حوالوں کی جستجو میں انھوں نے مدد دی ہے۔ جابجا انگریزی کے شکوک میں اُن سے تشفی حاصل کی گئی ہے۔ اپنے مرتبہ سے اتر کر انھوں نے تصحیح تک کی خدمت انجام دی ہے۔

کتابت کی غلطیاں گماؤ کیفا کسی حیثیت سے بھی ”مبادی“ سے کم نہیں ہیں بعض جگہ اقتباسات کے ترجمہ میں انگریزی لفظ کا انگریزی ہی خط میں نہایت بدنامیوں سے نظر آئیگا۔ خدا جانے یہ کاتب کی مہربانی ہے یا مسودہ میں نظر ثانی کے وقت کاٹنا رہ گیا۔ کچھ بھی ہو دوسرے ہی تجربہ کے بعد یہ تہیہ کر لینا پڑا ہے کہ جب تک کاٹ چھانٹ کے بعد مسودہ خوشخط اور صلی قلم سے صاف نہ کرایا جائے، اس وقت تک پریس کے حوالہ نہ کرنا چاہیے۔

عبدالباری

(دکن کالج پونہ۔ جنوری ۱۹۶۱ء)



سوانح

تمہید | آج جب ہم ہندوستان کو برکے سے روشناس کر رہے ہیں، تو یہ اپنے حالات اور تاریخی نوعیت کے لحاظ سے بہت کچھ اُس دور کے یورپ سے ملتا جلتا ہے، جب برکے ہستی میں قدم رکھنے والا تھا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی طرح سترھویں صدی کا یورپ زندگی کے تمام جوانب اور شعبوں میں اصلاح و تجدید کے لیے بیکل تھا، وہ مذہب، سیاست، تمدن، اور علوم کے لباس کهن کے ایک ایک تار کو اپنے جسم سے جدا کر رہا تھا۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے کیتھولک عقائد و اعمال سے عام بیزاری پیدا کر دی تھی۔ پوپ کا تخت تسلط الٹا جا چکا تھا، جمہوریت پسندی پھیل رہی تھی، ایوان شخصیت کے ارکان مترنزل ہو چکے تھے، بری یورپ کی سی نسالہ جنگ (۱۶۱۸ء - ۱۶۴۸ء) اور انگلستان کی خانہ جنگی (۱۶۴۳ء - ۱۶۸۸ء) مذہب و سیاست ہی کے اصلاحی مطالبات و مناقشات کے خونین مظاہر ہیں۔ علوم کا بھی یہی حال تھا حکمت (سائنس) کی متعدد نئی شاخیں پیدا ہو چکی تھیں، حکمیات قدیمہ کے بہترے سائل و نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ ہیئت کے انکشافات نے آفتاب کی جگہ زمین کو متحرک کر دیا تھا۔ کشش ثقل کا عالمگیر قانون، جو تاریخ حکمت کا سب سے عظیم الشان اکتشاف یقین کیا جاتا ہے، اسی صدی میں محقق ہو چکا تھا۔ برقی اور مقناطیسی تحقیقات سے عنقریب عالم جگمگا

اُٹھنے والا تھا۔

انقلاب انگیزی کی اس ہمہ گیر آندھی سے فلسفہ یا الکیات کی فضا کیونکر غیر متاثر یا مستثنیٰ رہ سکتی تھی، چنانچہ اتنا شدید بھونچال آیا کہ جس شاہ راہ پر طالب علم ملطی سے لیکر ارسطو، ارسطو سے لیکر ڈیکارٹ اور ڈیکارٹ سے لیکر لاک تک چلتے آئے تھے۔ وہ دفعۃً پانون کے تلے سے نکل گئی۔ تاریخ فلسفہ کے اسی انقلاب اعظم کا علم بردار ہمارا ہیرو ہے۔

انسان کی زندگی کے قدرتی طور پر تین حصے ہیں۔ لڑکپن یعنی نشوونما اور تحصیل و کسب کا سن جس میں دوسرے حصے کے لیے آدمی اپنے کو تیار و مستعد بناتا ہے۔ پھر جوانی، جو بہرہ و عمل کا عہد ہے۔ اور سب سے آخر بڑھاپا، جسکو انحطاط و غزلت کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے ہم برکلے کی حیات و حالات کو انہی تین قدرتی ابواب میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ لڑکپن

۱۶۸۵ء تا ۱۷۰۵ء

جو لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں، کہ بچہ پر انکی خاندانی روایات و ماحول اور سوسائٹی کے حالات و اطوار کا کیا اثر پڑتا ہے، اور یہ کہ اس کے مستقبل کے کارناموں کے اصلی اسباب و علل کی جستجو یہیں کرنی چاہیے۔ ان کو یہ معلوم کر کے نہایت افسوس ہوگا کہ برکلے کی زندگی کے اس پہلے ورق پر چند لکیر و ن سے زیادہ کچھ نہیں نظر آتا۔ اور انکی عمر کے ابتدائی پندرہ سال بالکل تاریکی میں ہیں، قیاس و استنباط کی روشنی میں ان لکیر و ن سے جو کچھ بڑھا جاسکتا ہے وہ پیشکش ہے۔

نام و نسب | پورا نام جارج برکلے ہے۔ آئرلینڈ کے پائے تخت ڈبلن سے تقریباً ۵ میل کے فاصلہ پر شہر ٹامس ٹاؤن کے پاس ڈائیسٹر کیسل نامی ایک چھوٹی سی آبادی میں

۱۲ مارچ ۱۶۸۵ء کو پیدا ہوا۔ باپ کا نام ولیم برکلی ہے۔ برکلی ایک نہایت وسیع خاندان کا نام ہے، جس میں ارل برکلی، سر برکلی، لارڈ برکلی وغیرہ، خطابات نظر آتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خاندان بہت ہی بارسوخ اور مغزز تھا، ولیم کا باپ غالباً جس وسیلہ سے اپنا آبائی وطن انگلستان چھوڑ کر آئرلینڈ میں آ بسا، وہ یہ تھا کہ سنہ ۱۶۷۷ء میں اسی خاندان کا ایک رکن لارڈ برکلی آف اسٹرٹن آئرلینڈ کا لارڈ لٹننٹ یا وائسرائے ہو کر وہاں گیا، ممکن ہے کہ ولیم لارڈ برکلی کا کوئی قریبی عزیز رہا ہو۔ لیکن بذات خود یہ معمولی حیثیت اور اوقات کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ علم نے اپنے فرزندوں کی تربیت کے لیے اکثر افلاس و بے نوائی ہی کی آغوش کو پسند کیا ہے، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں لکھا ہے کہ یہ بچگی میں ملازم تھا۔ بعد کو کچھ دن فوج میں بھی رہا۔ برکلی اپنے باپ کی سب سے بڑی اولاد ہے۔ پانچ بھائی اور ایک بہن اور تھی۔

برکلی کو آئرش فلسفی کنار دست نہیں | برکلی علی العموم آئرش فلسفی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی نووارد انگریز کا جو لڑکا یہاں پیدا ہو، اس کو تم ہندوستانی کہدو، کیونکہ ولیم خود انگلستان نزاوت تھا، اور برکلی کی پیدائش سے کل پندرہ سال پہلے نقل وطن کر کے آئرلینڈ چلا آیا تھا۔ چنانچہ مستفسرین ایک مقام پر اشارتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود برکلی اپنے کو انگلش میں سمجھتا ہے،

گلکینی کا اسکول | دس برس کی عمر تک یہ مطلق نہیں معلوم، کہ برکلی کس حال میں رہا، کیا پڑھا کس سے پڑھا۔ لیکن سنہ ۱۶۹۶ء میں جب یہ گلکینی کے اسکول میں داخل ہوتا ہے، تو اس کا نام سکند کلاس میں لکھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں سب سے نچلا کلاس پانچواں تھا۔ اس سے معلوم

لے برکلی کی ایک کتاب کا نام جو جکا ذکر آگے آویگا۔ اس میں استفسار ۹۱ و ۹۲ دیکھو فریزر ج ۲۔

ہوتا ہے، کہ گھر پر اسکی تعلیم و تربیت کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک نہیں کیا گیا تھا طبیعت میں انچ کم سنی ہی سے موجود تھی، ہر بات کو معمولی لڑکون کی طرح آسانی سے نہ قبول کرتا ہوگا، نہ محض سنی سنائی باتوں کو لے بھاگتا ہوگا۔ چنانچہ خود تعلقات میں ایک جگہ لکھتا ہے ”کہ میں آٹھ ہی برس کے سن سے بے اعتمادیاشکی تھا، اور اسلئے کہنا چاہیے کہ بالطبع، ان جدید خیالات کی جانب رجحان میلان کا مادہ موجود تھا۔“ مزاج میں اسی قسم کا شک یا بے اعتمادی اجتہاد اور حریت فکری کا سنگ اساس ہے۔ اسلئے مجتہد دل و دماغ رکھنے والوں میں بچپن ہی سے اس کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

کلکئی، برکھ کے سقط الراس سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا پر فضا اور خوش منظر شہر ہے، ۱۹۹۰ء میں جب یہاں کے اسکول میں داخل ہوا، تو اسی سال ٹامس پرائمری نام کا بھی ایک لڑکا داخل ہوا، جس کے ساتھ غالباً نہایت دوستی اور محبت کے تعلقات، اسی اسکول کی زندگی میں پیدا ہو گئے ہونگے، جو مرتے دم تک قائم رہے۔ یہاں ولیم کے ہونہا نوہال نے تقریباً ۱۴ سال بسر کیے، لیکن کیونکر اور کس طرح؟ یہ ہمکو بالکل نہیں معلوم۔ یہ تک تصدیق کے ساتھ نہیں ملتا کہ اس نے اس اسکول میں کیا کیا پڑھا۔ فریزر نے قیاس سے یہ لکھ دیا ہے کہ لاطینی کی کتاب سمجھنے لگا ہوگا، اور شاید کچھ آسان کتابیں یونانی کی بھی پڑھ لیتا ہو۔ ریاضی سے بھی بالکل بے گانہ نہ رہا ہوگا۔

غار ڈنور | فریزر نے ایک عجیب تناقض بیانی کی ہے۔ کلکئی سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر غار ڈنور کے نام سے کسی پہاڑی میں ایک نہایت تجسس انگیز اور حیرت افزا غار ہے، برکھ کی تجسس طبیعت اس کو بغیر دیکھے کیونکر مان سکتی تھی۔ اُس نے اس کو اچھی طرح دیکھا، اور ۱۴ برس کے

۱۴ برس کے لے یہ برکھ کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ اسکا بھی ذکر آگے آتا ہے۔

بعد محض یاد سے اس کا مفصل بیان قلم بند کیا۔ جو فریزر نے سوانح و مکاتیب کے ساتھ
چھاپ دیا ہے۔ اور فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ”اسکی تالیف تحریر نہیں دی ہوئی ہے، کالج
کی زندگی میں کسی تعطیل میں برکے نے اسکو دیکھا ہوگا“ مگر شروع میں جہان کلکنی کے حالات
لکھ رہا ہے، لکھ دیا ہے، کہ غالباً اسی زمانہ کے ایر پھیر میں برکے نے غار ڈنور کی سیر کی ہوگی
لیکن خود برکے کا بیان غور سے پڑھنے کے بعد یہ امر قریباً پوری طرح صاف ہو جاتا ہے کہ
سے پہلے اسنے اس کو حوالہ قلم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ”کون جانتا ہے
کہ پُرانے زمانہ میں آرٹ لینڈ والے اس غار سے وہی کام لیتے ہوں، جو روم اور نیپلس کے
مصنوعی غاروں سے وہاں کے قدیم باشندے لیتے تھے“ نیپلس وغیرہ کی سیاحت اُسنے
۱۷۷۱ء میں کی ہے۔ اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان مصنوعی غاروں کو دیکھ کر، اور ایک
فریج کتاب میں کسی اور غار کا حال پڑھ کر (جسکو یہ ڈنور کے غار سے بہت مشابہ بتلاتا ہے)
دفعۃً اس کا ذہن سات سال پیشتر کے دیکھے ہوئے غار ڈنور کی جانب منتقل ہوا ہو، اور
قدراً اس کو قلم بند کرنے کا جی چاہا ہوگا۔ لہذا اگر ہمارا یہ قیاس صحیح ہے تو کلکنی کے ۱۴
۵ سال کے کم سن اسکو بچہ نے اس ہیبت ناک غار کے دیکھنے کی ہمت نہیں کی، بلکہ
۱۸۰۹ء میں ۲۵ سال کے سن میں ٹرنٹی کالج کے ایم اے اور ڈیکن برکے نے اس کا
مشاہدہ کیا۔

بہر کیف خواہ برکے نے ڈنور کے اس عجیب و غریب غار کو اسکول یا کالج کے عہد
طالب علمی میں دیکھا ہو یا اس کے بعد۔ لیکن اس سے اسکی غیر معمولی خواہش تحقیق و تفحص کا
قطعی پتہ چلتا ہے، جو حالات اسنے لکھے ہیں وہ اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ ہر
معمولی ہمت و حوصلہ کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔ چنانچہ کچھ ساتھی مارے خوف کے

اتنے بے صبر ہو گئے کہ تھوڑی ہی دور تک اس کا ساتھ دیکر نکل آئے، لیکن اسے وہ سب کچھ دیکھا، جس کے بعد لکھتا ہے کہ ”اگرچہ زمانہ کے فصل نے جو جو کچھ مین نے یہاں دیکھا تھا ان میں سے بہت سی چیزوں کے صرف دھندلے اور نامتام نقش ذہن میں باقی رہنے دیے ہیں، لیکن اس عظیم اور محیر العقول غار کی دہشت خیز سنسانی، ہیبت ناک تاریکی، اور بھیاں ناک سنناٹے نے، میرے حافظہ پر ایسے اثرات چھوڑے ہیں جو کبھی محو نہیں ہو سکتے آگے چلکر اس کے اندر کے ایک چشمہ کے متعلق لکھتا ہے ”لیکن جو چیز سب سے زیادہ حیرت میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ اس چشمہ کی تہ مردوں کی ہڈیوں سے بھری پڑی ہے“ یہ سارا بیان نہایت دلچسپ ہے، لیکن خوف طوالت سے ہم صرف اس مختصر اقتباس پر قناعت کرتے ہیں۔

ٹینیسی کالج ڈبلن | ابھی سترھویں صدی کے اختتام میں کچھ مہینے باقی تھے کہ ہمارے فاروڈنوڈ کے مکتشف نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کر کے کلکنی سے ڈبلن کا رخ کیا، یہاں پہنچتے ہی میٹروپولیٹن پاس کر کے ٹینیسی کالج میں اعلیٰ تعلیم پر متوجہ ہوا۔

یہ وہ زمانہ ہے، جبکہ یورپ کی یونیورسٹیاں ارسطو کی غلامی سے رہائی حاصل کر چکی ہیں۔ مدرسیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ گلیلو، ڈیکارٹ، نیوٹن، لاک وغیرہ کے اکتشافات و تحقیقات سرعت و قبول کے ساتھ گھر گھر پھیلتے جاتے ہیں۔ خود ڈبلن کی یونیورسٹی میں جو قدامت پرستی کے لیے بدنام ہے، کہنا چاہیے کہ قدیم و جدید انکار کی معرکہ آرائیوں کا آخری دنگل تھا، مشائست اور مدرسیت شکست کھا کر اکھاڑہ سے نکل رہی تھی۔ ڈیکارٹ میبلے برائیکا، رابنز وغیرہ کے نظریات اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔ لاک کی کتاب فہم انسانی پر نہایت گراں گزم بخین ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی اور اسکی دیواروں سے باہر ایک سے

زاید ارباب کمال موجود تھے۔ ڈاکٹر پیٹر براؤن، جو فلسفہ کا نہایت ممتاز عالم تھا، اور لاک کا حریف نقاد خیال کیا جاتا تھا، ٹرنٹی کالج کا ناظم تھا، اور ڈاکٹر جان آل، جس نے برکے کے دل میں ریاضی کا شوق پیدا کیا، ناظم کی خدمت پر فائز تھا، سلسلہ ۱۶ میں ولیم گنگ ڈوبن کا اُپرچ بشپ ہو کر آیا۔ یہ اپنے زمانہ کا نہایت شہور محکم تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسکی شخصیت کا برکے پر کافی اثر پڑا ہوگا۔ چنانچہ بعد کی تحریروں میں ایک دوسرے کے بعض کلامی مسائل کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

غرض قدیم و جدید خیالات کی کشمکش اور ان اہل علم کی یکجائی نے برکے کے ذہن کے ساتھ سونے میں سہاگے کا کام کیا ہوگا، لیکن جیسا کہ تم کو ارد پر معلوم ہو چکا ہے، برکے ازل سے بدگمان اور کاوش پسند دماغ لے کر آیا تھا، اس لیے یہ ناممکن تھا، کہ ارسطو اور مدرسین کی عبودیت کے طوق کو اتار کر نیوٹن اور لاک کے غاشیہ برداروں میں شامل ہو جاتا، اس کے نزدیک اگر مشائیہ اور مدرسہ کا فلسفہ حکمت سر تا سر لفظوں کا کھیل تھا، تو نشاۃ جدیدہ، اور اسکے معاصر فلاسفہ اور حکما کے اصول و نظریات بھی ان خامیوں سے پاک نہ تھے اس لیے اُسے اپنا علم نصب کرنے کے لیے سب سے الگ میدان تلاش کیا۔

افسوس ہے کہ اسکی کالج کی متعلماۃ زندگی کے صفحہ پر بھی واقعات کی چند خشک تاریخوں کے سوا روایتاً اور کچھ نہیں نظر آیا۔ مارچ سلسلہ میں گلگنی کے اسکول سے ٹرنٹی کالج آیا۔ میٹرکولیشن پاس کیا سلسلہ میں اسکا لرشپ حاصل کیا۔ سلسلہ میں بی اے ہوا۔ سلسلہ میں ایم اے۔ اور اسی سال جون میں فیلو منتخب ہوا۔ یہ سہ سات سال سے

لے مزید تفصیل کے لیے خود فریئر دیکھو۔ سوانح و مکاتیب۔

زائد مدت کے واقعات کی کل کائنات، جو اٹھارھویں صدی کے فیلسوف ابر کے سوانح نگاروں نے ہمارے لیے مہیا کیا ہے، جس سے تشنہ کاموں کے لب بھی نہیں تر ہو سکتا۔ ہکویہ مطلق نہیں معلوم، کہ وہ اپنی یومیہ زندگی کے ۲۴ گھنٹے کن کن مشاغل میں صرف کرتا تھا۔ کس قسم کے لوگوں سے زیادہ ملتا جلتا تھا۔ عام عادات و اخلاق کیا تھے، اساتذہ اور تحشیون میں کس نظر سے دیکھا جاتا تھا، اسکول کا ساتھی ٹامس پرائر بھی کالج ہی میں تھا۔ غالباً کچھ ہی آگے پیچھے آیا ہوگا۔ اور آئندہ کے تعلقات سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ نوخیز فلسفی کا یہی سب سے بڑا نمونہ اور بے تکلف دوست رہا ہوگا۔ ۱۷۸۰ء کے اسکا لرشپ سے معلوم ہوتا ہے کہ خارجی مطالعہ کے ساتھ کالج کے کام و امتحانات میں بھی اپنے ساتھیوں پر سبقت و امتیاز رکھتا تھا۔

پھانسی کی آزمائش | اسی زمانہ کا ایک نہایت عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو بہ ظاہر نہ صرف مستبعد بلکہ ایک طرح کی جنون کاری نظر آتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ علم و تحقیق کے دیوانوں سے کچھ بھی دور نہیں۔ خصوصاً نارڈونر کے منڈر تجسس کی فطرت کے تو بالکل مطابق ہو، ہر حال قصہ یہ ہے کہ پھانسی کی سزا دیکھنے کا اشتیاق اس کو ایک دن سیاست گاہ لے گیا، اس بے بسی کی مجرمانہ موت کے نظارہ کا، اس پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ نہایت دل گرفتہ اور فکر مند لڑکا۔ ساتھی یہ خیال ہوا، کہ خود آزمائش کر کے دیکھنا چاہیے کہ کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کونٹرینی نامی اپنے ایک بے تکلف دوست سے صلاح کی کہ آؤ ہم دونوں تجربہ کریں۔ اور ایک اشارہ مقرر کر لیا کہ جس وقت وہ کیا جائے فوراً بند کھول دینا چاہیے، ہمارے انڈرگریجویٹ اسکالر نے پہل کی، چنانچہ کونٹرینی نے اسکو چھت میں باندھ دیا اور نیچے سے کرسی ہٹالی، نتیجہ یہ ہوا کہ اشارہ کا انتظار کیا جاتا تو چند لمحوں میں تجربہ کے شیدائی کی روح پرواز کر جاتی۔ کونٹرینی نے

پھرتی سے گرہ کھول دی اور یہ بے حس و حرکت زمین پر گر پڑا۔ دیر کے بعد ہوش آیا۔ اب بھلا کونٹری کی کیا بساط تھی کہ وہ اپنے اوپر اس آزمائش کی ہمت کرتا۔

غالباً اسی طرح کے اور واقعات اس سے ظاہر ہوتے رہتے ہونگے۔ اور انھیں کا یہ نتیجہ ہوگا، کہ کلج مین بعض لوگ تو اسکو عقل مجسم اور نہایت غیر معمولی انسان خیال کرتے تھے، اور بہت سے لوگ محض پاگل۔ یہاں تک کہ جب کبھی یہ فکر و مطالعہ کے زاویہ سے باہر نکلتا تھا تو بعض شریر لڑکے اگر اس کو گھیر لیتے تھے، اور بہت بناتے اور دق کرتے تھے۔ اسنے ایک آدھ بار شکایت بھی کی لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بلکہ جتنا یہ بھاگتا، اور سزا ہوتا تھا اتنا ہی وہ اور چھیڑتے تھے، اور یہ ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں سے سوسائٹی مین عام ریش کے خلاف کچھ بھی بیگانہ اور غیر معمولی عادات و اخلاق ظاہر ہوتے ہیں اور جو ذرا بھی جماعت کی بھیڑوں سے الگ چلنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سنگ اندازی ان علم کے مجنون کو اس کے جوش و انہماک سے نہیں باز رکھ سکتی تھیں۔ وہ برابر اسی دھن مین لگا تھا۔

کتاب تعلیقات | سات سال کے خارجی حالات زندگی مین مذکورہ بالا اعداد و ماہ و سن کے علاوہ بس یہ ایک قصہ ہوگا اور معلوم تھا۔ لیکن اپنے ذہنی واردات زندگی کی برکھ نے کتنا چاہیے کہ خود نوشتہ سوانح عمری ہمارے لیے چھوڑی ہے۔ جس سے نہ صرف اس کے خارجی احوال نگاروں کی بے اعتنائی اور غفلت شکاری کی اشک شوئی ہو جاتی ہے، بلکہ اس کی کا وہ نعم البدل ہے۔ کیونکہ برکھ کی عظمت کا اصلی راز اسکی حیات ذہنی ہی ہے۔

شاید کہ درین سیکڑا دریاہیم آن یار کہ در صومہ ما گم کردیم
یہ ذہنی سوانح ایک طرح کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جن کا نام ہم تعلیقات رکھتے ہیں

انکی ضخامت تقریباً ۹ صفحے ہے۔ ان میں اُس نے ایک جگہ لاک کی موت کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۹۴۷ء میں واقع ہوئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گریجویٹ ہونے سے پہلے ہی ان یادداشتوں کو اس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر غالباً سنہ مبادی کی تصنیف تک ان کا سلسلہ جاری رہا، ان تعلیقات کا مطالعہ متعدد حیثیات سے نہایت دلچسپ ہے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنکو فکری اور تصنیفی زندگی کا کچھ ذوق حاصل ہے۔

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، یا کسی کتاب کے پڑھتے وقت جو خیالات کسی مسئلہ کی نسبت ذہن میں خطور کرتے ہوں گے وہ بلا کسی خاص ترتیب کے اس کتاب یادداشت میں مجتمع ہوں۔ زیادہ تر ان کا تعلق علوم فلسفہ کے مسائل سے ہے مثلاً روح، زمان مکان، خدا، مادہ اسکے صفات، وجود، وغیرہ، ریاضیات و علم المرایا اور کمین کمین فلسفہ طبعی کے مباحث سے متعلق بھی اشارات ہیں۔ کلام و اخلاقیات پر بھی کافی ذخیرہ ہے لیکن حقیقت میں یہ سارا مجموعہ وہ میگزین ہے جس کے ذریعہ سے سنہ ۱۹۴۷ء میں ہمارا نوجوان فلسفی ماوریت کے اُن استحکامات کو زمین و دوز کر دینا چاہتا تھا جنکی طرف ڈھائی ہزار سال کی مدت میں فلسفہ و حکمت کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت نے بھی نظر اٹھا کے دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی، یعنی مرکزی حیثیت سے یہ تمام تعلیقات نظریہ رویت اور مبادی علم انسانی کا مولود و مصالحہ ہیں، چنانچہ جا بجا یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ فلاں خیال کو کتاب کے فلاں حصہ میں رکھنا یا استعمال کرنا چاہیے بہت سے ایسے جملے اور عبارتیں ملتی ہیں جو بعینہ ”مبادی“ میں منقول ہیں۔

دور جدید اور اپنے عصر کے تمام حکما اور فلاسفہ سے اچھی طرح واقف نظر آتا ہے۔

لے ان دونوں کتابوں کا مفصل ذکر آگے آدینگا۔

شاہیر علماء ریاضیات کے بہ کثرت نام ملتے ہیں مثلاً ہیلے، ڈیزنگ، ویس، کوپرس، بلی کیل وغیرہم۔ باقی ڈیکارٹ، نیوٹن اور ہائیس کی تحقیقات کا تو پورا علم رکھتا ہے اور لاک کا تو کہنا چاہیے کہ متعلم ہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکی کتاب فہم انسانی کو حرف حرف پڑھا ہی اور کچھ عجب نہیں کہ ایک سے زائد بار پڑھا ہو۔ قدم قدم پر اس کا نام اقتباسات اور حوالے آتے ہیں۔ اسپنوزا اور سیلے برانکا سے بھی آشنا ہے، لیکن انکی اسکے ذہن میں کچھ خاص وقت نہیں معلوم ہوتی،

بالعموم سوانح نگاروں نے یہ لکھ دیا ہے، کہ مبادی بلکہ مکالمات ہائیس کے زمانہ تصنیف تک برکے قدامت یعنی یونانیوں اور مدرسہ سے برائے نام ہی واقف ہے۔ لیکن یہ بیان بہت زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ مکالمات الیفا رن، لکھے وقت (۲۹ تا ۳۲) اس کا مطالعہ اور اسکی نظر بہت زیادہ وسیع ہے، لیکن علاوہ اور قرآن کے ان تعلیقات کے پڑھنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مبادی کا مصنف بھی یونانیوں اور مدرسین سے خاصی واقفیت رکھتا ہے، ایک سے زائد جگہ ارسطو کا ذکر ہے۔ بیگانہ دار نہیں، بلکہ آشنا کی طرح۔ اپیکورس اور اسکی بلند بانگ مادیت سے بھی خبر دار ہے۔ زینو کا اگرچہ نام نہیں لیکن انکار حرکت کا تصریح کے ساتھ حوالہ ہے حکیم ارسطیدس اور ارسطیدس تک کا علم رکھتا ہے اور مدرسہ سے اس کو قلیل الواقفیت کہنا تو نہایت عجیب ہے۔ مگر خود مبادی

۱۱۰ ہیلے وہی مشہور عالم ہیت ریاضی ہے جسکے نام سے ۱۱۰ء کا دم دار ستارہ مشہور ہے۔ ڈیزنگ ریاضیات کا وہ جید عالم ہے جس سے بلند پایہ صرف نیوٹن خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۱۰ء میں مرا۔ کوپرس دہلی آئی اور فرانس کے نامور علماء ریاضی ہیں جان کیل کی نسبت خیال لگاتا ہے کہ سب پہلا شخص ہے جس نے نیوٹن کے اصول کی تعلیم دینا بجز بات سے کی۔ ۱۱۰ء میں مرا۔

۱۱۱ ارسطیدس یونان کا سب سے بڑا عالم ریاضیات، ہیتیت وغیرہ کے متعدد آلات کا موجد تھا۔

ہی کے پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مدرسیت کی حقیقت کو اُس سے بہتر شاید ہی کسی نے سمجھا ہو، مان یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ ان ہوائی قلم بندوں کے ناموں کا حافظ نہ ہو لیکن اس حقیقت سے کامل طور پر آگاہ ہے کہ ان کا فلسفہ لفظوں کا طلسم ہے، البتہ یہ امر موجب حیرت ہے کہ یونانیون مین فلاطون اور سوفسطایہ ہی بھی وہ بالکل لاعلم معلوم ہوتا ہو۔

انہی تعلقات میں ایک علمی مجلس کے قیام کا دستور العمل بھی شامل ہے۔ یہ ہفتہ وار صحبت کہنا چاہیے کہ برکے ہی کے جوش و خریک کا نتیجہ تھی، جو جنوری سہ ماہ میں قائم ہوئی، اسکو ایک طرح کی پرائیویٹ صحبت سمجھنا چاہیے، جس کے ممبر ۸-۱۰ سے زیادہ نہ تھے اور یہ غالباً اسی کے ہم مذاق و مذاقے کالج رہے ہونگے، اس مجلس کا مقصد فلسفہ جدیدہ کے بعض مسائل پر بحث و گفتگو تھا۔ مجلس کی اہمیت اور اسکے بانیوں کی رفعت ذہنی اور بلند خیالی کا اسکی اس ایک دفعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب مجلس کے مقررہ موضوع پر اچھی طرح سے گفتگو ہوئے، تو پھر ممبروں کو اختیار ہے کہ کسی اور شے حکت سے متعلق اپنے مخصوص اجتہادات نئے افکار یا ملاحظات مجلس کے روبرو پیش کریں۔ اس صحبت میں بھی غالباً لاک ہی کے نظریات سب سے زیادہ زیر بحث رہتے ہوں گے۔

اب ہم تعلقات کے ایک اقتباس پڑاس دور زندگی کو ختم کرتے ہیں، جو ہمکو شروع ہی میں پانچویں یا چھٹے صفحہ پر ملتا ہے اور جو ہمارے مجتہد اعظم کی فکری زندگی کا دستور العمل (ماڈل) ہے، اور بس کے بغیر کسی شخص کو بھی اختراع و اجتہاد کا شرف نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہ اُسی فطرت کا ارتقا ہے جس کے آثار ہمارے ٹرنٹی کالج کے فیلو کو اپنے اندر آٹھ ہی سال کے سن سے نظر آتے تھے اور جنکو یہ اپنے مزاج کی بے اعتمادی یا شکی پن سے تعبیر کرتا ہو۔ ساتھی وہ پہلے ہی سے آگاہ ہے کہ اپنے اجتہادات کے اعلان کے بعد عصبیت و تقلید

کے غلاموں کی بارگاہ سے اسکو کیا کیا القاب ملین گے، یہ لوگ کھین گے کہ

”ذہنی زندگی کا ماٹو“ ”مین نوجوان ہوں“ ”مین نوخیز ہوں“ ”مین مدعی ہوں“ ”مین خود پسند ہوں“ بہتر ہے سب کچھ صحیح۔ مین تمام اُن پر تحقیر اور شنیع آمیز گالیوں اور القاب کو نہایت صبر سے برداشت کرنے کی کوشش کروں گا، جو کسی انسان کا غیظ و غرور و اختراع کر سکتا ہے۔ لیکن مین جانتا ہوں کہ ایک بات کا مین کسی طرح بھی مجرم نہیں ہوں یعنی مین اپنے اعتقاد کو کسی بڑے آدمی کے دامن سے وابستہ نہیں کرتا۔ مین تعصب و تقلید سے کوئی بات نہیں کہتا۔ مین کسی خیال پر صرف اس لیے نہیں اڑتا کہ وہ قدیم ہے۔ سلم ہے اور رائج ہے، یا اسکے مطالعہ اور تحقیق پر مین نے بہت زیادہ وقت صرف کیا ہے۔“

۲۔ عہد جہد و عمل

(۱۸۳۲ء تا ۱۸۳۷ء)

سلسلہ کی ۱۲ مارچ کو برکٹ نے اپنی عمر کے ۲۲ سال پورے کر کے تیٹسٹون مین قدم رکھا اور پہلی ہی سہ ماہی کے لگ بھگ جون مین ایم لے اور فیلو ہوا۔ جسکے ساتھ ہماری تقسیم کی رو اسکی زندگی کا پہلا باب بند ہوتا ہے۔ اور اب ہم اس دور مین داخل ہوتے ہیں جسکو انسانی حیات کا حاصل سمجھنا چاہیے۔ اسی دور کے ابتدائی تین سالوں کا کارنامہ ہمارے اس ٹرینی کلج کے ایم اے اور فیلو کی فلسفیانہ عظمت کا ضامن ہے۔ یون تو یہ ایم اے ہونے سے چند دن قبل ہی سلسلہ کے اوائل مین ٹرینی کلج کے بی اے کے پردہ مین حساب الخیرہ برلاطینی زبان مین دو چھوٹے چھوٹے رسالہ لکھ کر گم نام شائع کر اچکا تھا۔ اور اس طرح کہنا چاہیے کہ بامیس ہی برس کے سن مین مصنفین کی صف مین شامل ہو چکا تھا۔

لیکن حقیقت مین جس چیز نے برکٹ کو برکٹ بنایا اور جس کے بغیر ان لاطینی رسائل کا

کوئی نام بھی نہ جانتا، وہ فلسفہ اور سنہ کے تصنیفی کارنامے ہیں۔ جن کا مواد گریجویٹ ہونے کے بہت پہلے سے چک رہا تھا، اور تعلقات میں منتشر طور پر یادداشتوں کی صورت میں جمع تھا، ایم اے ہوتے ہی یہ ان تعلقات کو مرتب و مدون کرنے کی ادھیڑ بن میں لگ گیا ہوگا۔ اور غالباً سنہ میں یا اس سے بھی پہلے پرس مین دینے کی نیت سے مفصلاً ترتیب دار لکھنا شروع کر دیا ہوگا۔ لیکن قطعیت کے ساتھ تدوین و تحریر کی مدت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جدید نظریہ رویت | بہر کیف سنہ کے آغاز میں جدید نظریہ رویت کے عنوان سے اُس نے اپنے مکمل فلسفہ کا ایک رُخ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ محسوسات بصر سے بحث ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آنکھ سے مجز رنگ اور روشنی کے اور کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ شکل و صورت امتداد و فاصلہ وغیرہ کو محسوسات بصر میں داخل کرنا غلطی ہے۔ یہ تحقیق اگرچہ برکلی کے اصلی فلسفہ کی صرف تہید تھی لیکن بجائے خود نفسیات حواس اور مرئیات (ایپکس) کا ایک ایسا عظیم الشان اکتشاف تھا جس نے علم النفس اور علم المرایا کی تاریخ کا نیا دور شروع کر دیا۔ اور برکلی کا نام تاریخ فلسفہ کے ساتھ تاریخ حکمیات (سائنس) کی بھی ایک غیر منفک کڑی بن گیا۔ اس کتاب نے اس قدر لوگوں کی توجہ کو کھینچا کہ اسی سال دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا۔ اور مصنف کی اتنی ہمت بندھی کہ

مبادی | سنہ ہی میں، جبکہ اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اپنا مکمل اور اصلی فلسفہ مبادی علم انسانی کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کا حاصل اور نقطہ مرکزی یہ ہے کہ انسان کے ذہن یا روح سے باہر ایک ذرہ کا بھی وجود نہیں۔ مادہ فقط ایک بمعنی لفظ ہے۔ زمین اور آفتاب، چاند اور ستارے، دریا اور پہاڑ، باغ اور درختوں کی ہستی

اور حقیقت اُن ذہنی احساسات کے ماسوا کچھ نہیں جنکو غلط فہمی سے موجودات خارجی کا مشنی یقین کیا جاتا ہے۔ جن چیزوں کو ہم موجودات خارجی کے نام سے پکارتے ہیں، وہ دراصل صرف ہمارے ذہنی ارتسامات و نقوش ہیں، جنکو براہ راست ہر وقت ایک رز روح (خدا) اپنے یہ قدرت سے ہمارے ذہن پر نقش کرتی رہتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ محض نفس یا روح کا وجود ہے۔

مبادی کے ساتھ معاصرین | یہ فلسفہ کے حرم (مادہ) پر گونہ باری کی ایسی شدید گستاخانہ جرات تھی
کی بے اعتنائی | جو اپنے پرستاروں کے دل میں غضب کی آگ اور تحقیر و نفرت کے جذبہ کے علاوہ کچھ نہیں پیدا کر سکتی تھی چنانچہ عوام کا تو کیا ذکر خود علما، کلام و فلسفہ کے حلقوں میں اس ادعا کو دیوانے کی بڑے زیادہ وقعت نہیں دیکھی بلکہ شروع شروع میں تو اس آواز کی سماعت تک کا نون کو گران تھی۔ اس کے علاوہ غالباً برکلی کی کم عمری اور معاصرانہ لاک نے بھی ایسے مجتہدانہ اور انقلاب انگیز خیال کی جانب لوگوں کو اعتنا کرنے سے باز رکھا ہوگا، کچھ بھی ہو، جب اسکو ڈیٹن وائرلینڈ میں کوئی داد نہ مل سکی تو وطن کی قدر دانی سے مایوس ہو کر لندن کے بعض شاہیر کو مبادی کا ایک ایک نسخہ بھیجا۔ یہاں بھی بالعموم تو وہی سلوک ہوا لیکن پھر بھی اس کو بہت غنیمت جانا چاہیے کہ یہاں بعضوں نے اس کو نہ صرف توجہ کے ساتھ پڑھنا ردارکھا، بلکہ اس قابل سمجھا کہ کوئی چوٹی کا شخص اس کا جواب دے، چنانچہ ہسٹن جو اس زمانہ میں بہ حیثیت ریاضیات کے پروفیسر کے سر اسحق نیوٹن کا کیمبرج میں جانشین تھا، اور برکلی سے غالباً چند ہی مہینے پہلے مرا، لکھتا ہے ”کہ مسٹر برکلی نے دین میں مسئلہ میں اپنا یہ الیماتی نظریہ شائع کیا کہ مادہ کوئی حقیقی شے نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں

۱۰ تصنیفات کے ذیل میں مبادی کے ذکر میں برسیل کا خط پڑھو۔

بلکہ یہ کہ اسکی حقیقت کا عام اعتقاد اگر مضحکہ خیز نہیں تو بے بنیاد تو قطعاً ہے۔ موصوف نے غایت سے ڈاکٹر کلاڑک اور جگو اس کا ایک ایک نسخہ بھیجا۔ جب ہم دونوں اس کو پڑھ چکے تو مین ڈاکٹر کلاڑک کے پاس گیا اور اس پر گفتگو کر کے یہ کہا کہ مین راہیات پر عبور نہ رکھنے کی وجہ سے) مسٹر برکلی کے استدلال کے دقیق مقدمات کا جواب نہیں دے سکتا، گو کہ مین اس کے (مہمل) نتیجہ کو نہیں تسلیم کرتا۔ لہذا میری خواہش ہے کہ آپ جو ان دقائق کے تہ رس ہیں اور مسٹر برکلی کے نتیجہ سے متفق نہیں معلوم ہوتے، جواب لکھیں۔ اس سے ڈاکٹر کلاڑک نے انکار کیا۔

برکلی کی ذات میں مذہب فلسفہ | بالعموم لوگوں کے دلوں میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ فلسفہ اور مذہب کا دوش بدوش اجتماع میں قدیم سے ان بن ہے اور ایک کو دوسرے سے وہی میر ہے، جو آگ کو پانی سے ہے، اسی کا اثر ہے کہ فلسفہ اور فلسفی کے لفظ میں مذہب بیزاری اور بیگانگی کا مفہوم التزاماً داخل ہو گیا ہے، لیکن اگر تاریخ فلسفہ کو سامنے رکھ کر استقصا کیا جائے تو غالباً ایسی مثالیں بہت زیادہ نکلیں گی جنہیں فلسفہ اور مذہب دوش بدوش رہا ہے۔ برکلی بھی اسی غائب قعدا کا ایک نمایاں رکن ہے۔ وہ اس حقیقت کا قائل ہے کہ اگر فکری رفعت و مسرت کا مبداء حکمت و فلسفہ ہے تو اخلاقی اور اجتماعی سعادت کا سرچشمہ مذہب و تدین ہے، چنانچہ جہاں اس کا دماغ حکیمانہ افکار سے بھر پور ہے، وہاں اس کا ہاتھ انجیل سے مشغول ہے۔ اسکی شخصیت کلیسا کے ممبر پر نظریہ جدید و مبادی کے صفات سے اتنی مختلف نظر آتی ہے کہ یہ باور کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ وہی برکلی ہے۔ اس کے عظوں کی بنیاد تمام تر انجیل کی آیات پر ہوتی ہے۔

لے یہ پوری عبارت فریڈ نے یادگار کلاڑک، مصنفہ و ہنس کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ سیمول کلاڑک اپنے زمانہ کا نہایت نامور عالم فلسفی، منطقی اور ریاضی دان ہے۔ برکلی نے خود مبادی میں ایک جگہ اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔

لے اطاعت غیر متعادمانہ اور متعالہ بنام حکام وغیرہ پڑھو۔

اسکی تعلیمات کتاب مقدس کے اقتباسات سے پُر اور مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہم خوف طوالت سے یہاں کوئی حصہ نہیں نقل کر سکتے۔ لیکن انگریزی دانوں کیلئے ان وعظوں کا پڑھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تدیس اور کلیسائی خدمات | اتفاق کی خوبی دیکھے کہ زندگی کے یہ دونوں پہلو خارجی واقعات میں طابق النعل بالنعل ہیں۔ نظریہ جدید کے نکلنے سے کچھ ہی قبل اس کا مصنف یکم فروری ۱۸۵۱ء کو اپنے ہی کالج کے کلیسا کا ڈوئکن مقرر ہو چکا ہے۔ اس مذہبی عہدہ کا کام طلبائے کالج کو وعظ و تلقین تھا۔ باقاعدہ اس فرض پر مامور ہونے سے پہلے بھی یہ اس خدمت کو انجام دیتا ہوگا۔ چنانچہ جو وعظ اسکے فریزر نے جمع کئے ہیں ان میں سب پہلا جنوری سہ ماہی اور غالباً اس کے ذاتی ہی شغف و میلان مذہبی کو دیکھ کر اس کو مناسب وینیتہ کی یہ ابتدائی عزت دی گئی ہوگی جہاں سے یہ بڑھتے بڑھتے آخر کار بشپ کے اعلیٰ المنصب پر فائز ہوا۔ پھر ستمبر میں سب لکچر ز نام زد ہوا۔ جو تدبیری عہدہ تھا، اور ساتھ ہی ساتھ اسی سال نومبر میں جو نیر ڈوئکن کا رتبہ حاصل ہوا جو ڈوئکن سے بلند ہے۔ دو سال کے بعد ستمبر کے نومبر میں یونانی زبان کا جو نیر لکچر مقرر ہوا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ یونانی کا اچھا خاصا ماہر تھا۔ لاطینی پر تو اس کو اتنا عبور تھا کہ اس میں ایک سے زائد کتابیں لکھیں۔ اُسے ان قدیم زبانوں کو اس طرح نہیں پڑھا جس طرح ہمارے کالجوں میں طلبہ عربی فارسی وغیرہ زبان ثانی پڑھتے ہیں جس سے بجز امتحان پاس کرنے کے اور کوئی کام نہیں لے سکتے۔ ان تمام تدیس اور کلیسائی خدمت سے فریزر کے بیان کے مطابق تقریباً ۱۸۷۰ء یا ۱۸۷۱ء سال کی آمدنی تھی جو موجودہ سکہ کی رو سے ڈیڑھ سو پاؤنڈ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

غرض ایم اے ہونے کے بعد سے ستمبر کے اوائل تک تقریباً چھ سال کا زمانہ

ان تدریسی اور کلیسائی فرائض منصبی کی انجام دہی اور مطالعہ و تصنیف کے خالص علمی مشاغل میں بسر ہوا۔ اس مدت کو اسکی خاموش اور بے خلل عالمانہ زندگی کا عہد سمجھنا چاہیے جو پھر سولہ برس کے بعد وائٹ ہال میں جا کر نصب ہوا۔ فریزر کی تحقیقات کے بہ موجب اسی عرصہ میں ۱۸۷۳ء میں چند دن کے لیے تبدیل آب و ہوا اور بعض دوسرے اسباب سے یہ انگلستان گیا، جسکی بابت ہمکو کچھ اور تفصیلی حال نہیں معلوم۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے آئرلینڈ سے باہر قدم نکالا۔

اطاعت غیر متاوانہ پر وعظ | ۱۸۷۳ء میں جنویر ڈین کی حیثیت سے اس نے کالج کے کلیسا میں غیر متاوانہ اطاعت پر تین وعظ کئے تھے، جنکی بنیاد انجیل کی ان آیات پر ہے کہ ”جو آدمی طاقت کی مقاومت کرتا ہے وہ خدا کے حکم کی مقاومت کرتا ہے“ اور ”توفیق و فحور کا مرتکب نہ ہونا، تو جھوٹی قسم نہ کھانا، تو اعلیٰ طاقت کی مقاومت نہ کرنا“ ان آیات سے عیسائی وہی کام لیتے ہیں، جو سلمان اولی الامر منکم سے، اگرچہ ۱۸۷۳ء کے انقلاب کے بعد سے انگلستان میں شاہی اقتدار اور شخصیت کا کہنا چاہیے خاتمہ ہو چکا تھا، لیکن ٹورنیر اور وہگزن نام سے جو دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں جنکو ہم علی الترتیب شاہ پسند اور آئین پسند کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی صورت میں باقی چلی آتی تھیں، اور اب تک قائم ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک برسر اقتدار ہو جاتی تھی اور کبھی دوسری ۱۸۷۳ء میں ملکہ اینی کی حکومت کا آخر زمانہ تھا، اور شاہ پسندوں کا دور دورہ تھا۔ لازماً ان وعظوں سے یہ افواہ پھیل گئی کہ برکلے اس جماعت کا حامی اور طرفدار ہے، اسی افواہ کی تردید کے لیے ۱۸۷۳ء میں اسنے ان تینوں خطبات کو ایک چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا۔ لیکن جو خیال دلون میں جم گیا تھا اس کا نکلنا آسان نہ تھا، پناچہ اسکی بدولت، جیسا کہ آئندہ چلکر معلوم ہوگا، اس کو تھوڑا سا نقصان بھی

اٹھنا پڑا۔ کچل جبکہ شخصیت اور استبداد کے خلاف بات بات پر علم بناوت بلند کر دینا حریت و آزادی کا شعار خیال کیا جاتا ہے، ان خطبات کا پڑھنا حیرت و دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اپنے قارئین کے استعجاب کے لیے اس رسالہ کے 'تعارف' کی چند سطریں ہم یہاں اقتباس کیے دیتے ہیں۔

”یہ امر کہ کسی سیاسی طاقت کی علی الاطلاق غیر مقادمانہ اطاعت نہیں جائز ہے، بلکہ کسی حکومت کی فرمانبرداری سوسائٹی کی عام فلاح و کے ساتھ مشروط و محدود ہونی چاہیے اور اسی لیے جب عامہ خلق کی بہبود کے لیے علانیہ طور پر ضرورت محسوس ہو، تو رعایا جائز طور پر حکمران قوت کے خلاف مقادمت کر سکتی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا ان پر واجب ہے، کیونکہ رفاد عام کی ترقی تمام لوگوں کا ناگزیر فریضہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے خیالات جنگو میں بنی نوع انسان کے لیے تباہ کن اور عقل سلیم کے قطعاً مخالف خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا، گزشتہ چند سالوں کے ملک کے قابل و تعلیم یافتہ گروہ کی جانب سے نہایت مستعدی کے ساتھ پھیلنا جاتا ہے، ہین اور انتہائی فوائد کی روشنی میں پیش کیے جاتے ہیں، لہذا یہ ضروری معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے نوجوانوں کو ان کے خلاف مسلح کر دیا جائے اور اس بات کا اہتمام رکھا جائے کہ وہ جب دنیا میں داخل ہوں تو صحیح اور عمدہ اصول کی رہنمائی میں داخل ہوں۔ میرا یہ منشا نہیں کہ وہ اندھے پن سے کسی ایک خاص گروہ کے ساتھ متعصب ہو جائیں، بلکہ صرف یہ کہ شروع ہی سے وہ اپنے فرض اور اس کے روشن اور عقلی دلائل سے آشنا کر کے ایسے اعمال کے لیے مستعد و مضبوط بنادے جائیں جن سے وہ پورے عیسائی اور اطاعت شعار رعایا معلوم ہوں۔

اس سچی یا سیاسی عقیدہ کے خطا و صواب سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے

خارج ہے لیکن اتنا بغیر کے نہیں رہ سکتے کہ استدلالی حیثیت سے یہ خطبات نظریہ جدید اور مبادی کے مصنف کی شان سے بہت پست اور کم رتبہ ہیں۔ ان چند بندوں کو چھوڑ کر جن میں غمنا اس نے اپنے فلسفہ اخلاق کا ذکر کیا ہے اور جو ایک طرح کی مذہبی افادیت ہے۔ جس سے ہم کسی دوسرے موقع پر تفصیلاً بحث کریں گے باقی سارا رسالہ سقیم اور مغالطہ آمیز دلائل سے بھرا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آخرین اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہنا چاہیے کہ اضطرابِ اسیر انگندہ ہو جانا پڑا ہے۔

فرد سیاحت | ۱۳۳۲ء سے لیکر ۱۳۳۴ء تک بیس سال سے زیادہ کا زمانہ وطن سے باہر انگلستان، فرانس، اٹلی، اور جزیرہ رہوڈ وغیرہ کی سیاحت میں بسر ہوا۔ اس مدت میں کل ٹھکانی تین سال کے لیے بیچ مین برکے آئرلینڈ گیا، باقی ساری مدت تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ سفر میں گزری۔ غالباً فردری یا مارچ ۱۳۳۲ء میں یہ لندن پہنچ گیا۔ یہاں آنے کے متعدد محرکات قیاس کیے جاتے ہیں، مثلاً علمی حوصلہ مندی، سیر و سفر کا شوق، اصلاحِ صحت وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کوئی نمایاں اور ممتاز کام کرتا ہے تو قدرتا اس کو خواہش پیدا ہوتی ہے کہ باہر نکلے اور لوگوں سے مل جل کر دیکھے کہ اسکی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں۔ اس سے کیونکر پیش آتے ہیں۔ اس کے کارناموں کی کیا وقعت ہو۔ یہ ایک ایسی فطری خواہش ہے جس سے زاہد و صوفی، حکیم و فلسفی کوئی خالی نہیں ہو سکتا۔ البتہ اکثر یہ تحریک اتنی مخفی ہوتی ہے کہ آدمی کو خود دستور نہیں ہوتا۔ ٹرینیٹی کالج، ڈبلن کی چار دیواری اس جذبہ کی تسکین بخشی کے لیے اب بہت تنگ تھی مصنف مبادی کی حوصلہ مندانہ آرزوں کے لیے وسیع تر میدان درکار تھا۔ لندن ہر قسم کے ارباب کمال اور زندگی کی جولانیوں کا مرکز تھا۔ بس اصل میں ہی پنہان لیکن قومی محرک تھا جو لندن کھینچ لایا۔ باقی صحت وغیرہ زیادہ

زیادہ اس اصل محرک کے تائیدی اسباب قرار دیے جاسکتے ہیں۔

لندن میں شاہیر سے ملاقاتیں | چنانچہ لندن پہنچتے ہی وہ تمام شاہیر سے ملنے جلنے میں مصروف نظر آتا ہے، جنہیں سوفٹ جسکی کتاب گلوبرس ٹراڈل سے اسکول کا ہر لڑکا واقف ہی، سیاسی اور علمی دونوں حلقوں میں ایک بار سوخ شخص تھا، اور برکلی کو ٹرنٹی کلج ہی کے زمانہ سے بخوبی جانتا ہوگا۔ اس نے غالباً سب سے پہلے اس کو لارڈ برکلی آف اسٹرٹین سے اس کے عزیز کی حیثیت سے ملایا۔ پھر اور وزرا و امرا سے اس کا تذکرہ کیا۔ اسکی کتابیں انکو ہدیہ دینے لارڈ برکلی نے اپنے اس قابل صد نازش عزیز کو بشپ ایٹربری سے ملایا۔ جو خود نامور اور ممتاز عالم تھا۔ اور اس ڈبلن کے فلسفی کا پہلے ہی سے مشاق تھا۔ جب ہمارا برکلی اٹھکر چلا آیا، تو لارڈ برکلی نے بشپ سے پوچھا، کہ آپنے میرے اس عزیز کو اپنی توقعات کے مطابق پایا۔ اس نے نہایت حیرت سے اپنے ہاتھ اٹھا کر کہا ”کہ میں جب تک اس شریف انسان سے نہیں ملا تھا، اس قدر عقل، اس قدر علم، اس قدر معصومیت، اور اس قدر تواضع کو صرف فرشتوں کا حصہ خیال کیا کرتا تھا“ اسی زمانہ میں یہ مشہور شاعر پوپ سے ملا، ایڈیسن سے بھی ملاقات کی جسکی شاعرانہ اور ادبی شہرت کا شباب تھا، ایڈیسن ہی کے اشارہ سے برکلی اور سیمول کلاک (جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں) کے مابین مباحثہ کی ایک صحبت قرار پائی جس کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ برکلی کی اس شکایت سے زیادہ کچھ نہ نکلا کہ ”میرا حریف اگرچہ میرے دلائل کا جواب نہ دے سکا، لیکن انصاف و بے تعصبی کی اتنی جرأت نہ رکھتا تھا کہ اپنی تسکین یا شکست کا اعتراف کر لیتا“ اس قسم کی مناظرانہ گفتگو کو علمی جوش اور انگ کا ایک تماشہ سمجھنا چاہیے۔ ورنہ بحث و مباحثہ سے کہیں لوگوں کے عقائد و اذعانات بدلا کرتے ہیں۔

آزاد خیالوں کے خلاف گارجین میں مضامین | جس طرح ہمارے ملک میں جدید تعلیم و خیالات کے

اثر سے ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو روشن خیال یا آزاد خیال کے لقب سے فخر مند و ذہین ہے، جس کے نزدیک مذہبی و عادی کی حقیقت ایک فسانہ کمن یا عہد جہالت و توحش کی یادگار سے زیادہ نہیں۔ اس طرح علم و حکمت کی نئی نئی تحقیقات و انکشافات نے بعینہ اسی نوعیت کی ایک جماعت انگلستان میں پیدا کر دی تھی، جو وحی و الہام، خسر و نشر، روح و خدا وغیرہ کے اعتقادات کو محض حدیث خرافات جانتے تھے اور رسائل و اخبارات میں انکی منہسی لڑتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے لیے آزاد خیال کا نام اختیار کیا تھا۔ لندن میں ان کا تہا ضرور شور تھا، برکے کی دینی حمیت و غیرت بھلا اسکی کب روادار ہو سکتی تھی۔ اتفاق سے اسی سالہ میں سر رچرڈ اسٹیل نے ایک نیا روزانہ پرچہ گارجین کے نام سے جاری کیا۔ ہمارے پرچہ مذہبی فیلسوف نے ان آزاد خیالوں کے خلاف اس میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، جو کئی مہینے تک جاری رہا، سب سے پہلا مضمون کولنس اینتھونی کی تردید میں ہی جو اس طائفہ کا سرگروہ اور اقبالی عقیدہ کا ایک مناقشہ پسند مصنف تھا۔ آزاد خیالی انسانی حریت، وغیرہ کے عنوان سے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ لاک کے اپنے تعلقات تھے، کہ مرتے وقت اپنی کچھ جائداد اسکے لیے چھوڑ گیا، برکے کے یہ تمام مضامین، جنکی تعداد ۱۴ ہے، تمثیلی استدلال پر مبنی ہیں۔ خطابیات اور انشا پر دازی کا بھی کافی چٹکارہ ہے، بہ حیثیت مجموعی برکے کی جانب ان مضامین کی نسبت سے اسکی وقعت میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا، کہا جاتا ہے کہ ان مضامین کا وہ معاوضہ بھی لیتا تھا، جو فی مضمون ایک گنی تھا، کوئی مضمون تین چار صفحات سے زیادہ کا نہیں ہے، ہمارے ملک کے صحائف نگاروں کو اس مثال سے ہمت حاصل کرنی چاہیے۔

مکالمات ہائے اشاعت | لندن کے اسی زمانہ قیام میں برکے نے مکالمات مابین

ہائلس و فلوئس کے نام سے تین مکالموں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ یہ مبادی کے فلسفہ و خیالات کی زیادہ عام فہم تعبیر تھی، تاکہ زیادہ وسعت سے انکی اشاعت ہو، چنانچہ نظریہ رویت و مبادی دونوں سے زیادہ انکو مقبولیت حاصل ہوئی، فریزر نے اسپر جو دیا پچ لکھا ہے اس کا پہلا جملہ یہ ہے کہ ”یہ کا زمانہ انگریزی کے لٹریچر الہیات کا گہر درخشان ہے، اسکی تیاری و ترتیب میں غالباً برکے سلسلہ میں یعنی لندن آنے سے پہلے ہی مصروف تھا۔ بس یہ آخری کتاب ہے جس کے بعد کہنا چاہیے کہ پھر قریباً ۱۶ سال کے لیے اسکی تصنیفی زندگی سچھے بڑھ گئی۔

فرانس وائل | اسی سلسلہ کے نومبر میں لندن کے دربار کی جانب سے مورڈنٹ ارل آن پیٹر بورڈسلی کا سفیر مقرر ہوا۔ انگلستان کے عائد و امرا کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنے لیے ایک مخصوص پادری رکھتے ہیں جو انکو اور انکے گھر والوں کو گر جا کرتا ہے اور مذہبی فرائض انجام دیتا ہے۔ اس پادری کو چیلپین کہتے ہیں۔ سوٹ کی سفارش سے مورڈنٹ نے ہمارے برکے کو اپنا چیلپین، اور سکریٹری بنا کر ہمراہ لیا۔ یہ قافلہ لندن سے سیدھا پیرس پہنچا، جہاں سے ۲۵ نومبر کو برکے اپنے کلکنی اور ٹرنٹی کالج کے پرانے یار ٹامس پرائر (برکے کے سب سے زیادہ خطوط اسی کے نام ملے ہیں جن میں غایت محبت و بے تکلفی سے اس کو ڈیر ٹام سے مخاطب کرتا ہے) کو سب سے پہلے خط میں لکھتا ہے کہ ”جب سے میں یہاں آیا ہوں، چرچ، خانقاہوں، شاہی محلات، کالجوں وغیرہ کے دیکھنے میں منہمک ہوں۔ یہ عمارتیں اس شہر میں نہایت کثیر التعداد اور شاندار ہیں۔ انکی عظمت و خوبی یقین سے باہر ہے۔“ اسی خط میں لکھا ہے کہ ”کل فادر میلے برانکا سے ملکر بعض مسائل پر گفتگو کا ارادہ ہے“ لیکن پھر غالباً مل نہیں سکا۔ یہاں سے تقریباً ایک ماہ کے قیام کے بعد اٹلی کا رخ کیا اور کوہ آپس کی

دشوار گزار راہ اختیار کی۔ طبیعت میں شوخی و ظرافت کافی موجود ہے، خطوط میں سفر نہایت دلچپ انداز سے بیان کیے ہیں۔ اٹلی میں داخل ہو کر شہر ٹورن ۶۵۰ سالہ کو پھر ڈیرٹام کو لکھتا ہے ”راہ بھر میں بس کل چار بار گھوڑے پر سے گر کر آخر صبح پہنچ گیا ہوں، جس سے اس کے علاوہ کچھ نقصان نہیں ہوا کہ تلوار، گھڑی اور ناٹوٹ گئی۔ راہ کی ہیبت و خطرات بیان کرتے کرتے لکھتا ہے ”کہ اب میں ہوا، موسم پالا اور برف سے مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط ہو گیا ہوں“ لیکن آگے چل کر لکھتا ہے کہ نصیحت ہو کہ احباب سلی جاتے ہوئے کبھی الپس کی راہ نہ اختیار کریں۔“

سال بھر کے اندر پھر لندن اپریل ۱۸۸۱ء میں دفعۃً ملکہ اپنی کا انتقال ہو گیا۔ جارج نے تخت پر ہی ٹوری جماعت کے تمام دوزار و ارکان کو جو اسکی تخت نشینی کے خلاف تھے ایک کر کے نکال دیا۔ اور اسی عتاب کی لپیٹ میں لارڈ مورڈنٹ بھی آگیا۔ اور پورا سال پایا تھا کہ برکے کو اپنے دلچپ سفر سے اگست ہی میں لندن واپس آنا پڑا۔ لیکن اس دس مہینے کی مدت میں فرانس کے علاوہ جنوا، لگ، ہارن وغیرہ اٹلی کے بہت مقامات کی سیر کر لی۔

کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں برکے کے ایک لائق شاگرد مولی نیوکس نے جو وائس کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا، اپنے فلسفی استاد کو شہزادہ اور شہزادی سے ملنے کی کہ اسکو آئرلینڈ میں کوئی معقول کلیسائی منصب مل جائے، چنانچہ شہزادی نے آئرلینڈ لارڈ جسٹس گالوے سے سفارش بھی کی۔ لیکن گالوے کے قانون میں اطاعت غیرت کے دغظون کی افواہ پڑ چکی تھی جسکی وجہ سے یہ برکے کو شائبہ نظر سے دیکھتا تھا، اور ٹور کا حامی سمجھتا تھا، مولی نیوکس نے اس شبہ کو دور کرنے کی بھی کوشش کی مگر کچھ

نخل سکا۔

۱۷۷۷ء میں فرانس ٹولی کا سفر | ان چند مہینوں کی سیر سے برکلے کے شوق سیاحت کی تسکین تو کیا ہو سکتی تھی بلکہ زندگی کے تازہ تجربات اور نئے نئے مشاہدات نے اس خواہش کو اور تیز کر دیا ہوگا۔ اتفاق یہ کہ اگلے ہی سال اس کے لیے ایک اور سامان پیدا ہو گیا۔ کلوگر کا بشپ ڈاکٹر ایٹن اپنے لڑکے جارج ایٹن کو بری یورپ کی سیاحی کے لیے بھیج رہا تھا۔ برکلے سے خواہش کی حیثیت میوٹر کے حکام کو ہی قبول کرے، ابکی یہ سلسلہ سے لیکر سترہ تک تقریباً پانچ سال باہر رہا، اور غالباً یورپ کے اکثر مقامات کی سیر کی ہوگی، لیکن ہمارے پاس فرانس اور آئی سے آگے بڑھنے کی کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے۔

۱۷۷۸ء کی ۱۳ اکتوبر کو پیرس میں میلے برانکا مرا۔ اسکی موت کے سبب قریب کی نسبت اسکا کتے برکلے کی سوانح عمری میں ایک عجیب قصہ لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ برکلے اس سے ملنے گیا۔ یہ پھیپھڑے کے مرض میں مبتلا تھا، اور بیٹھا ہوا کچھ دوا پکا رہا تھا۔ باتیں ہوتے ہوتے برکلے کے نظریہ پر گفتگو چھڑی۔ مباحثہ کی گرما گرمی میں بوڑھے فلسفی نے اپنی آواز اتنی بلند کر دی اور اس قدر جوش سے بھر گیا کہ اسکی بیماری ترقی کر گئی جسکی بدولت چند ہی روز میں مر گیا۔

روزنامہ سیاحت | ۱۷۷۸ء تو اغلباً فرانس ہی میں ختم ہوا۔ ۱۷۷۹ء و ۱۷۸۰ء میں ہیکو بالکل نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ باقی ۱۷۸۱ء اور ۱۷۸۲ء کا اکثر حصہ یقیناً آئی ہی میں بسر ہوا۔ یہاں یہ اپنے دار و ات کار روزنامہ نہایت اہتمام اور تفصیل سے قلم بند کرتا رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس بیچ باوجود حادثہ نے، کہنا چاہیے، صرف چند اوراق ہمارے لیے چھوڑے ہیں لیکن ۶

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

ہم انہی باقی ماندہ اوراق سے بہت کچھ نتیجہ نکال سکتے ہیں، اس روزنامہ کی سب سے پہلی

تاریخ، جنوری ۱۹۵۷ء اور سب سے اخیر ۱۲ اپریل ۱۹۵۷ء۔ باقی بیچ مین رسنے مہینوں کے مین کل تقریباً ۱۰ صفحات ہیں۔

نظر کی ہمہ گیری | ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے اٹلی کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ عام قاعدہ ہے کہ سیر و سفر مین ہر آدمی کی نگاہ اپنے مخصوص مذاق کی چیزوں پر پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے سیاح کی نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ کسی صنف و مذاق کی قابل لحاظ چیز اسکی توجہ سے محروم نہیں رہتی جس جگہ اس کا گزر ہوتا ہے پورا جغرافیہ لکھ دیتا ہے۔ حدود، رقبہ، آبادی، پہاڑ، دریا، پیداوار، تجارت، سطح کی بلندی و پستی، سمندر سے فاصلہ وغیرہ ہر چیز کو اس کا بیان محیط ہوتا ہے۔ قدیم و جدید عمارات، تصاویر و مجسمات وغیرہ کو ناقدانہ نگاہ سے دیکھتا ہے، انکے حسن و قبح کو واقف کار فن کی طرح بیان کرتا ہے، تاریخی یادگارین یا مقامات جب سامنے آتے ہیں تو وہ انکے متعلق دلچسپ تاریخی حوالے دیتا جاتا ہے۔ میسلس کے حالات مین دہان کا سارا نظام حکومت و سب کر دیتا ہے۔

قومی عوائد و مراحم لوگوں کے عادات و خصائل کے مطالعہ کے لیے خطرات تک کی نین پر واہ کرتا۔ جزیرہ انیرم کے حالات کے ذیل مین پوپ کے خط مین لکھتا ہے کہ اس دلکش جزیرہ کے باشندے چونکہ دولت و ثروت سے خالی ہیں، لہذا ان بڑائیوں اور جاقوتوں سے بھی بری ہیں جو اس کا لازمہ ہیں، اور اگر یہ لوگ انتقام جوئی سے بھی اسی قدر بے گانہ ہوتے جتنا مال و متاع کے حرص و حوصلہ سے ہیں تو عہد زرین کے شاعرانہ تخیل کی تصدیق جلتی لیکن فوراً اسی بات پر قتل و خونریزی کی قبیح عادت انکے لطف و مسرت کا ایک ناپاک جز بن گئی ہے جسکی ایک مثال ہمارے یہاں پہنچنے کی دوسری ہی رات پیش آئی یعنی ایک ۱۸ سال کا نوخیز ہمارے دروازہ ہی پر بار ڈالا گیا۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے کام سے کام

تھا، ایسے ان خطرناک لوگوں میں صحیح و سلامت زندہ رہے۔

پہاڑ، دریا، سبزہ زار وغیرہ قدرتی مناظر کے ساتھ حد سے زیادہ دلچسپی ہے یہی خط مذکورہ بالا ٹکڑے کے علاوہ، باقی تمام تر انہی چیزوں سے پر ہے، جنکو نہایت مزے لگے کر بیان کیا ہے۔ ایک اور خط میں تین صفحے سے زیادہ کوہ دیو دیس کی آتش نشانی کے فرو ہونے کے بعد خود پہاڑ پر جا کر جہان نہایت دقت سے پہنچ سکا ہے ایک ایک چیز کو دیکھا اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

کوئی عجیب بات سن پاتا ہے تو اسکی تحقیق کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ جنوب اٹلی میں جب سیر کر رہا تھا، تو معلوم ہوا کہ یہاں بعض مقامات خصوصاً ٹریفٹو میں ایک بہت بڑی کڑی ہوتی ہے جس کے کاٹنے سے آدمی اکثر مر جاتا ہے۔ اس کا علاج گانا بیان کیا جاتا ہے، جسکے اثر سے آدمی گھٹنوں ناچتا رہتا ہے، اور کبھی ناچتے ہی ناچتے مر بھی جاتا ہے۔ ہمارے مجلس مزاج سیاح نے کئی جگہ اپنے روزنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے، لوگوں سے اس کے متعلق استفسارات کو خود ایک آدھ بار یہ عجیب و غریب ناچ دیکھا ہے۔ اور جو شواہد جمع کیے ہیں ان سے اس کا میلان اسکی تصدیق کی جانب معلوم ہوتا ہے۔

نمبر ششم میں جب یہ اٹلی کی سیر میں مشغول تھا، اپنے کالج میں جنیر فیلو سے سینئر فیلو منتخب ہوا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ٹریفٹو کالج سے اس کا تعلق منقطع نہیں ہوا تھا، بلکہ سلسلہ سے لیکر جب یہ کالج سے مکالمہ تک جب یہ واپس گیا برابر رخصت پر تھا، جسکی وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی رہی۔ اب ہم اس روزنامہ کی سب سے پہلی تاریخ کی چند دن سطر دن کے اقتباس پر بری یورپ کے ایام سفر کو ختم کرتے ہیں۔ اس تاریخ یعنی، جنوری کو وہ ویشی کان کے مشہور

ساحل درم کے ایک مشہور اور شاخہ لولسلہ عمارت کا نام ہے، جس میں پوپ کا محل عجائب خانہ، لائبریری، کلیسا وغیرہ شامل ہیں۔

کتبخانہ کے دیکھنے میں مصروف رہا۔ اس اقتباس سے ہمارے اوپر کے بیانات کی ایک حد تک تصدیق ہوگی کہ اسکی ہمہ گیر نظر صرف نادر کتابوں یا اپنے خاص مذاق کی کتابوں کی دیکھ بھال تک نہیں محدود ہے۔ بلکہ ہر شے کے لیے جو ہر شناس نگاہ رکھتا ہے۔

ڈیٹکان کی لائبریری کی سر [آج صبح میں نے ڈیٹکان میں ایک گیلری کو قدموں سے ناپا، جو ۴۸۰ قدم لمبی تھی۔ ہم نے اس قصر کا مشہور کتب خانہ دیکھا۔ اس میں قلمی اور مطبوعہ سب ملا کر بہتر ہزار کتابیں ہیں، یہ اپنی قسم کی بے نظیر عمارت ہے جو تناسک کے لحاظ سے نہایت خوبصورت اور شاندار ہے اور اسکی تصاویر بہترین ہاتھوں کی دستکاری میں۔ اسکی شکل یہ ہے T، سب سے بڑا المبان قریباً ۸۰۰ فٹ کا ہے، تمام کتابیں ڈسکون یا شلنگون میں چنی ہوئی ہیں، جو دیوار سے لگا کر اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ یہ تمام ڈسک بلندی میں برابر اور اتنے نیچے ہیں کہ سب اوپر کی کتاب بھی بلا کسی زحمت کے مل سکتی ہے، ہنر ور جل کے ایک قلمی نسخہ دیکھا جو چودہ سو سال سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کے شروع انیڈ کی چار متنازع فیہ نظمیں نہیں تھیں۔ ایک اور اس سے بھی پرانا نسخہ ہکو دکھلایا گیا۔ لیکن وہ ناقص تھا، یہ دونوں نسخے نہایت جلی اور گنجان خط میں لکھے تھے، پہلے میں اوقاف تھے، دوسرے میں مطلق نہیں۔ دونوں تصویروں سے مزین تھے لیکن پہلے کی تصویریں دوسرے سے بہت زیادہ وحشیانہ نہیں، جسکی بنا پر خیال کیا جاتا کہ یہ (دوسرا) کم پرانا ہے۔ ایک نسخہ ٹرنس کے بھی دیکھا، جس کے خصوصیات سے ہمنے فیصلہ کیا، کہ یہ بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ ایک نسخہ نہایت قدیم زمانہ کے سٹیمپو اجنٹ کا دیکھا.....

ہنری ہشتم کے (انابولین کے نام) عاشقانہ خطوط دیکھے۔ اور اس کی وہ کتاب

۱۔ دوم کا ایک نامور شاعر جس نے ہومر کے الیاذہ کے نوٹ پر اینڈ کی رزمیہ ٹنوی لکھی ۲۔ ڈراما نویس شاعر کا نام ہے۔

۳۔ یہ لفظ لاطینی سے ماخوذ ہے جسکے معنی شتر کے ہیں، جو عتیق کے اس پونانی ترجمہ کا نام پڑ گیا جو جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۷ آدمیوں نے ملکر کیا ہے۔

جو اُس نے لو تھر کے خلاف لکھی تھی، اور جسکی بدولت اس کو حامی دین کا لقب ملا تھا، اُسکے
 ادل میں پوپ کے نام کا جو خط منسلک ہے اس میں اس نے صراحت کے ساتھ اسکی تصنیف کو
 اپنی جانب منسوب کیا ہے (اس پر میری نظر اس لیے پڑی کہ گ اس میں شک کرتے ہیں
 تیسرے پہر کو ہم نے اُن محبوں کو دیکھا، جو وٹیکان کے رو کاہنوں کے حصہ میں ہیں جنہیں
 سے خاص خاص یہ ہیں، کلیوٹیرا، اپالو، مشہور و کون، اور انٹینس زمانہ قدیم کے
 کمالات کے بہترین نمونے ہیں۔ اپالو اور لو کون کی تعریف کا تو کبھی حق نہیں ہو سکتا۔
 سلسلہ میں پریس کی روائل اکاڈمی کی جانب سے ایک انعامی مضمون کا اعلان
 ہوا، جس پر برکلی نے بھی ۲۰-۲۵ صفحہ کا رسالہ لاطینی زبان میں لکھا، اور اٹلی سے واپسی میں
 اس کو اکاڈمی میں پیش کیا ہو گا لیکن انعام ایک اور شخص کو ملا جسکی وجہ یہی سمجھنا چاہیے کہ یوم
 ابھی اتنا بے تعصب نہیں ہوا تھا کہ اُن اجتہادات کو قبول کرے، جن سے ہزاروں برس
 کے مسلمات کی تردید ہوتی ہوئی سالہ دراصل مبادی کی ایک کڑی جو۔ عام خیال یہ ہے کہ
 بے جان موجودات خارجی باہم ایک دوسرے کی علت و معلول ہوتے ہیں۔ مثلاً آگ کا غذا
 کو جلاتی ہے۔ پانی آگ کو بجاتا ہے۔ اس رسالہ میں اسی کی تردید کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا
 گیا کہ محسوسات میں کوئی شے کسی شے کی علت نہیں ہو سکتی، بلکہ حقیقی علت صرف نفس یا روح کا
 ارادہ ہے۔ یہی وہ اساس ہے، جس پر آگے چلکر ہیوم نے اپنے نظریہ علت کی عمارت کھڑی
 کی۔ یہ رسالہ لندن میں سلسلہ میں پہلی بار چھپا۔

سلسلہ کلیوٹیرا، مسمر کی یونانی نژاد مشہور ملکہ جو اپنے حسن و جمال، جرائم اور بد بختیوں کے لیے شہرِ وفات ہے۔
 (۲) اپالو، روشنی کا دیوتا۔ (۳) انٹینس دوم کے ایک نامی شاہنشاہ ایدرین کا محبوب و مقرب نوجوان جسکو
 اُس نے متبنی کیا تھا اور جسکے نام شہر اپالوس بسایا۔ (۴) اپالو کے معبد کا ایک مجاور (پریٹ)

سنہ کے آخرین انگلستان غرض غالباً سنہ کے آخرین ہمارا فلسفی سیاح فرانس ہوتا ہوا، بحر
فرانس اور بحر جنوبی کا فتنہ انگلستان واپس آگیا۔ اس زمانہ میں سارا ملک خصوصاً لندن، بحر

جنوبی کی اسکیم کی تباہی کے فتنہ و آشوب میں گرفتار تھا۔ جسکی جمل حقیقت یہ ہے کہ دینم ثالث
کے عہد حکومت کی لڑائیوں کی بدولت گورنمنٹ جس قومی قرضہ سے زیر بار ہو گئی تھی، وہ
بڑھتے بڑھتے پانچ کروڑ تیس لاکھ پاؤنڈ تک پہنچ گیا تھا، اس کا صرف سود تیس لاکھ پاؤنڈ سالانہ
ادا کرنا پڑتا تھا، جو سلطنت کی آمدنی کا نصف حصہ تھا، اس بوجہ کے ہلکا کرنے کے لیے مختلف
تدبیریں اختیار کی گئی۔ انہی میں سے ایک یہ تھی کہ کچھ لوگ اس پر آمادہ ہوئے کہ اگر گورنمنٹ
ہم کو بحر جنوبی میں کامل حقوق کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے ایک کمپنی قائم کرنے کی
منظوری دیدے تو ہم قومی قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لیے آٹھ لاکھ سالانہ دینے کے علاوہ
ایک گران قدر رسم سر دست پیش کرتے ہیں یہ اسکیم منظور کر لی گئی، اس کمپنی کے منتظرین نے
حصہ خریدنے والوں کی کشش و میلان کے لیے پیشتر کر دیا کہ بحر جنوبی کے جزائر میں سونے
کی کانوں کی بدولت بڑی دولت ملے آئی ہے، پھر کیا تھا، لوگ حصوں کے خرید کے لیے
دوانے ہو گئے، اور ہر امر اپنا پونڈ تک کے حصہ خرید لیے گئے، کیونکہ ہر شخص جانتا تھا کہ کسی آسان
اور فوری طریقے سے محنت و مشقت کے بغیر روپیہ ملے گا۔ لیکن ہویہ دیا تھا کہ ارباب اسکیم
تجارت تو کم کرتے تھے اور گلچہ سے زیادہ اڑاتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ دفعہ سنہ میں سارا بھاڑا
چھوٹ گیا، ہزاروں شہر کا تباہ ہو گئے، سیکڑوں آدمی بے خانان ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے
اس کے ماسوا عام طور پر ہر طرف لوگوں میں عیاشی، بداخلاقی، اور بددیانتی پھیلی ہوئی تھی، محنت
وجہا کشی سے روزی پیدا کرنے کی قابلیت مفقود تھی۔

بریکے نے فلسفی نہ تھا، اس کا دل انہماک جنس اور قوم و ملت کے دروبے بھر رہا تھا،

شورش و تباہ کاری کا یہ نظردیکھ کر اس سے نہ رہا گیا، اور برطانیہ عظمیٰ کو بربادی سے بچانے کی راہ کے عنوان سے ایک مبسوط رسالہ لکھ کر گنہام شائع کیا۔ اس میں اس نے بتلایا کہ برطانیہ کی تباہی کے اصلی اسباب الحاد و بددینی کی اشاعت، عیاشی، فضول خرچی اور کالعدمی ہیں۔ بحر جنوبی کی ناکامی کی تین ہی اسباب پنہان ہیں۔ اس لیے ”اگر ہم اپنی نجات چاہتے ہیں تو ہم کو وینڈر سیانہ رو، اور جفاکش بنا چاہیے۔ اس نے اس میں اقتصادی ترقی و تنزل کے اس نکتہ سے نہایت وضاحت کے ساتھ آگاہ کیا کہ ”جس قدر کسی قوم میں بغیر ہنر و جفاکشی کے دولت کمانے کے طریقے رائج ہونگے، اُسی قدر اس میں ان دونوں (ہنر و جفاکشی) چیزوں کی کمی ہوگی“ اس نے اپنے ان دعاوی کو یونان، اور روم کی تاریخی مثالوں اور ہالینڈ، اسپین، پرتگال وغیرہ کی زندہ شہادتوں سے (جو اس زمانہ میں صنعتی و تجارتی ترقیات کے لحاظ سے یورپ میں ممتاز تھے) واضح کیا ہے۔

بارگشت وطن | چند ہی مہینے لندن میں گزرنے پائے تھے کہ آئرلینڈ جانے کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہو گئی، ۸ سال سے باہر تھا، احباب دیاران وطن سے ملنے کا قدرۃ اشتیاق بڑھ گیا ہوگا۔ اگست ۱۸۸۰ء میں گریفن کا ڈیوک ثانی چارلس آئرلینڈ کا لارڈ لفٹن یا وائسرائے مقرر ہو کر جاریا تھا برکلی کو اریل برنگٹن کی سفارش سے، اسے اپنا چیلین بنا کر ہمراہ لے لیا۔ یہاں ڈبلن یونیورسٹی کے ارباب نے ٹیٹی کلچ کے اس سرمایہ فخر پرانے متعلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور متعدد تعلیمی و دینی مناصب پر اس کا بہیم تقرر عمل میں آتا رہا۔ جنکو اس نے تقریباً دو سال تک انجام دیا۔ تفصیل یہ ہے۔

سینئر فیلو تو پہلے ہی سے تھا۔ ۱۴ نومبر ۱۸۸۰ء کو یونیورسٹی کی جانب سے دینیات کے پیکر اور ڈاکٹر کی ڈگری عطا کی گئی۔ ۲۰ کو دینیات کا پیکر، اور یونیورسٹی واعظ بنایا گیا۔

۴ جون ۱۹۳۷ء کو عبوری لکچر کی جگہ خالی ہوئی اس پر بھی اسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ زمین سینیئر پراکٹر (متم یا نگران) کی انتظامی خدمت سپرد ہوئی۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ چار پانچ سو پاؤنڈ سالانہ اندازہ کیا جاتا ہے۔ ساتھی ساتھ وائسرایے (لارڈ چارلس) کا جیلیمن بھی رہا۔ جس کا کام ایسا تھا کہ ان نئے فرائض سے عمدہ برائی میں خارج ہوتا۔

بے سان دگمان دولت | ۱۹۳۷ء کے نصف اول میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جسے ڈاکٹر برکے کے حالات اور اردن میں بہت کچھ تغیر پیدا کر دیا ہوگا۔ ایستھر جو دانیامری نام ایک دولت مند تاجر کی لڑکی تھی۔ اس کے مان باپ مرچکے تھے۔ تنہا تمام جائیداد کی مالک تھی، کہا جاتا ہے کہ سوفٹ کے اس کے ساتھ کچھ عجیب پر اسرار تعلقات تھے، اور اس خاتون نے اپنی تمام کائنات اس کے حوالہ کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ لیکن اسے نہایت شرمناک غدارانہ سلوک کیا۔ جس سے اس کا دل بھٹ گیا۔ اور ۱۹۳۷ء میں مرتے وقت اس نے اپنی تمام جائیداد کی وصیت ہمارے برکے اور ایک اور شخص رابرٹ مارشل کے نام کر دی۔ کل مالیت آٹھ ہزار پاؤنڈ کی تھی جس میں یہ دونوں نصف نصف کے شریک تھے۔ برکے ۱۹۳۷ء میں جب لندن میں تھا، تو سوفٹ کیساتھ صرف ایک مرتبہ ایستھر ہان ڈنیزن شریک ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بس یہی پہلا اور آخری موقع ہے کہ برکے نے ایستھر کو دیکھا تھا۔ لہذا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ برکے کو اس خبر سے کس قدر اجنبھا ہوا ہوگا۔ قیاس یہ کیا گیا ہے کہ اسکی دلکش اخلاقی شخصیت کا یہ ایک کرشمہ تھا۔ کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ جو شخص اولین ملاقات میں بشپ ایڈمبری کو فرشتہ مجسم نظر آیا ہو، اس نے چند ہی گھنٹوں کی کجائی میں ایستھر کو ہمیشہ کے لیے گردیدہ و مسحور کر لیا۔

ڈیری کی ڈبیری | اس واقعہ کے تقریباً سال بھر بعد ڈیوک آف گریفن کی سرپرستی اور قدردانی

کی بدولت ۲۲ ستمبر کو ڈاکٹر برکلی ڈیری کی دوہندہ ڈیری کے لیے نام زد ہوا، ڈین یون بھی ایک نہایت وقیع کلیڈائی منصب ہے، جو پیشے صرن ایک درجہ نیچے ہے۔ لیکن ڈیری کی ڈیری خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی تھی۔ اور اس زمانہ میں آرلینڈ کے چرچ کا ایک نہایت ممتاز اور بزرگ عہدہ خیال کیا جاتا تھا۔ اسکی آمدنی گیارہ سو پاؤنڈ کے قریب تھی۔ اسی مہینہ کی ۱۰ کو اس رتبہ ڈین پر اسکی جانشینی کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی۔ یہ جگہ چونکہ خود اپنے مستقل مشاغل و فرائض رکھتی تھی اسلئے کلج سے فیلوشپ اور لکچری وغیرہ کے عاملانہ تعلقات اس کو منقطع کرنے پڑے۔

جزائر برمودا میں کلج | ابھی ڈاکٹر برکلی کو ڈین برکلی بنے شکل سے چار مہینے گزرے تھے قائم کرنے کی اسکیم | کہ یکایک سوٹ کے ایک خط سے ہکویہ خبر ملتی ہے کہ وہ امریکہ کے باشندوں اور شہریوں کی تعلیم کے لئے جزائر برمودا میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے۔ اس تخیل کی تکمیل کا اس نے غیر متزلزل عزم کر لیا ہے اور اس کے لیے وہ اس درجہ بے کل ہے کہ اگر ڈیری سے اسکو سکد و شش نہ کر دیا گیا تو اس کا جگر شق ہو جائیگا۔“ سوٹ کا یہ خط جسکی تاریخ ۲ ستمبر ۱۸۷۲ء ہے، آرلینڈ کے موجودہ وائسرائے کے نام ہے جس میں اس سے سفارش کی گئی ہے کہ برکلی کو اس کے اس مقصد میں مدد دے۔ برکلی کے مربی ڈپرک آف گریفٹن کی وائسرائے کا زمانہ مئی ہی میں اس کو ڈین بنانے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔

سوٹ کے اسی خط میں تصریح ہے کہ برمودا میں کلج قائم کرنے کا یہ تخیل آج سے تین سال پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ یعنی جب وہ انلی کے سفر سے واپس آکر لندن میں مقیم تھا، اور بحر جنوبی کا فتنہ بالکل تازہ تھا۔ اس کے تباہ کارانہ عواقب اور انگلستان کی عام

مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی اتری کا، جو شدید اور یاس انگیز اثر بر کلمے کے دل پر پڑا تھا، اس کا اندازہ
 تم اُس رسالہ سے کر سکتے ہو، جو برطانیہ عظمیٰ کو بربادی سے بچانے کے لیے اُس نے لکھا تھا۔
 اس بنا پر یہ بات قریب قریب قیاس ہے کہ سرزمین وطن کی اصلاح و نجات سے مایوس ہو کر،
 علم و مذہب کی خدمت کے لیے نئی دنیا (امریکہ) کی بن جنتی لیکن صالح زمین پر اس کی نگاہ انتخاب
 پڑی ہوگی۔ جیسا کہ خود اس کی ایک نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”میوز (علم و فن کی دیوی) انگریزین (انگریزوں)
 سے بیزار ہو کر ایک بعید خطہ ارض (امریکہ) میں زرین عہد کے لیے چشم براہ ہے، جہاں کی آب
 و ہوا دلکش ہے، جو خصوصیت کا تحت گاہ ہے، جہاں قدرت رہنما اور نیکی حکم ران ہے۔“ لیکن
 ایک گروہ اب بھی نہیں کھلی کہ آخر یہ تخیل تین سال تک کیوں سویا رہا۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ اس
 مہم کو سر کرنے کے لیے برکے نے اپنے بے در باتوں کو از بس ضروری خیال کیا ہوگا۔ اولاً وجہ
 معاش سے اطمینان دے فکری، ثانیاً کسی ایسے موثر کلیسیائی مرتبہ کا حصول، جو اس کی آواز
 کو حکومت کے ایوان اور قوم کے مختلف طبقات میں زیادہ موثر اور وسیع بنا سکے۔ اب یہ دونوں
 شرطیں مجتمع ہو چکی تھیں۔ پہلی ایستھر کی وصیت کی بدولت اور دوسری ڈیمیری کے منصب میں
 بہر کیف، کچھ بھی ہو، ڈوین برکے کو اپنے اس سہ سالہ خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے
 ستمبر ۱۸۴۲ء میں ہم پھر لندن میں پاتے ہیں۔ یہاں بھینچکر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس
 اسکیم کے اغراض و مقاصد کو مفصلاً شائع کیا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مقصد
 تو امریکہ کے وحشی باشندوں میں مسیحیت کی تبلیغ اور علم و تمدن کی اشاعت ہے، اگرچہ اس
 غرض کے لیے اس صدی کے آغاز ہی سے مختلف ممالک یورپ سے مشن بھیجے جا رہے
 تھے، اور ستمبر میں اسی کام کے لیے امریکہ میں ایک مستقل جمعیت کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی،

لیکن اب تک جس طرح کے مشنری بھیجے جاتے تھے وہ چونکہ نہایت کم علم و کم حوصلہ ہوتے تھے ان کے اندر ملت اور انسانیت کی خدمت کے ایثارانہ جوش و ولولہ کا فقدان ہوتا تھا، اسلئے وہ اپنی شکم پروری اور تن آسائون میں بھنس جاتے تھے۔ برکلی کے نزدیک کامیاب اور مستقیم راہ عمل یہ تھی کہ سب سے اول ایک کالج بنایا جائے جس میں تن دی سے کام کرنے والے مبلغین امریکہ کے حالات و ضروریات کے مناسب تیار کیے جائیں اور سب سے بڑھکر اس امر کی کوشش کی جائے کہ خود وہاں کے باشندے اس کالج میں تعلیم حاصل کر کے اپنے ہومپٹون کو خود انکی زبان میں علم و مذہب کے نجات بخش اصول سے آگاہ کریں جو بہت زیادہ سریع التأثير طریقہ ہے۔

فلاسفہ کی نسبت یہ عام بدگمانی ہے کہ بے شک وہ عالم سماوی کے دقائق و غوامض کی ایسی پر اسرار داستان بیان کر سکتے ہیں کہ معمولی لوگوں کی عقلیں دنگ بجاتی ہیں لیکن عالم ارضی کے کاروبار میں انکے ذہن بالکل نہیں چلتے، فلسفی کے ایک محدود معنی میں یہ بدگمانی بالکل بے بنیاد نہیں ہے، لیکن برمودا اسکیم کے مجوز فلسفی کا دامن کمال قطعاً اس نقص سے پاک ہے۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لیے اس تجویز برمودا کے ایک بند کا اقتباس کافی ہے جس میں اسے بتلایا ہے کہ قیام کالج کے لیے کیسی جگہ ہونی چاہیے۔

”انتخاب مقام میں بہت سی باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ آب و ہوا عمدہ ہو،

کھانے پینے کی چیزیں سستی اور براہ فراط ہوں، امریکہ اور جزائر کے تمام

حصوں سے تعلق قائم رکھنا آسان ہو۔ بحری قزاقوں و حشیوں اور دوسرے

دشمنوں سے بے خوف و محفوظ ہو، تجارت کی منڈی ہو، کہ کالج کے طلبہ

اور فیلو اپنا اصل کام چھوڑ کر تاجر بننے کے حریص ہو جائیں۔ وہاں دولت کی

بتات اور عیش پرستی کا چرچا نہو کہ ان کا دھیان اُچٹ جاے اور انکی انہماک
 مین کمی واقع ہو یا انکو اپنی سادی اور متوسط زندگی سے غیر مطمئن اور
 بے قناعت بنا دے۔ سبب آخر یہ کہ وہ ان کے باشندے بشرطیکہ ایسی
 کوئی جگہ ملے، اپنے عادات کی سادگی اور مصومیت کے لحاظ سے ممتاز
 ہوں۔ جگہ کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ نکتہ نوجوان طلبہ کے اخلاق
 کے سوا زنی مین کس قدر اہم ثابت ہوگا، اور شن پر کتنا زبردست اثر
 اس کا پڑے گا۔

اس کے بعد اسنے تفصیل وار بتلایا کہ یہ تمام خصوصیات جزائر برمودا مین مجتمع ہیں
 برمودا از قارہ امریکہ سے تقریباً پچھ سو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا مجمع الجزائر ہے جو جنوبی
 بحر اٹلانٹک مین واقع ہے، کہنے کو تو اس مین ۳۰۰ کے قریب جزیرے شامل ہیں، لیکن
 کل رقبہ ۲۰ میل مربع سے زیادہ نہیں، آب و ہوا کے لحاظ سے انکو سردا بہار کہا جاتا ہے۔
 اس اسکیم کا لندن کے بعض مغرز حلقوں مین نہایت پر جوش استقبال کیا گیا، کچھ
 چندہ بھی فراہم ہوا، لیکن برکے کو یہ دھن تھی، کہ گورنمنٹ سے کوئی گران قدر امداد اور
 شاہی چارٹر ملے، اس مقصد کے حصول کے لیے اُسنے دوڑ دھوپ کا کوئی طریقہ اٹھانین
 رکھا۔ علمی مشاغل اور فلسفیانہ غرور و تمکنت تک کو بالائے طاق رکھ دیا، دربار داریان
 کین۔ کارولن، شہزادی ویس کو علمی و مذہبی صحبتوں اور مناظروں سے سجد شوق تھا،
 اس نے ایک ہفتہ وار مجلس قائم کر رکھی تھی، جس مین برکے کو سمول کلا رگ کا، جو
 زندہ تھا، حریت بنکر جانا پڑا تھا۔ ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غماے دگر

بالآخر سیٹھ مین بیڑا پار لگا، چارٹر کے ساتھ بیس ہزار پاؤنڈ کا وعدہ گورنمنٹ نے کر لیا۔ کلج کا نام سینٹ پال کلج قرار پایا۔ خود برکھے پہلا پریسڈنٹ مقرر ہوا، عہدے اور مناصب متعین ہو گئے، مقاصد کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے بعد دو برس سے زائد برکھے اور لندن ہی میں رہا۔ اس زمانہ کے بہت سے خطوط جو ڈیرٹھام کے نام لکھے گئے تھے محفوظ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آئرلینڈ میں اسکی جائیداد وغیرہ کی دیکھ بھال اور تمام معاملات تمام ہی کے سپرد ہیں جتنی جائیداد کے جھگڑے اب تک چلے آتے ہیں۔ مرحومہ کے قرض خواہ لندن میں برسکے کو آ کر دق کرتے ہیں۔ دوسرا شریک معاملات کو صاف نہیں ہونے دیتا۔ آخر میں اس نے تنگ آ کر لکھا ہے کہ دکلہ سے مشورہ کر کے تنہا میرے حصہ پر قرض وغیرہ کا جو کچھ بار پڑتا ہو، وہ جلد سے جلد چکا دیا جائے۔ اپنے بھائیوں کو ٹھام سے اکثر روپیہ کی دماند کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی تعلیم وغیرہ کا پورا کفیل ہے۔

شادی | ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کے خط سے دفعۃً ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے برمودا نیورسی کے پریسڈنٹ نے شادی کر لی۔ اور کل مع اپنی بی بی اور تمام جماعت کے جزیرہ رہوڈ کے لیے پابہر کا ب ہے۔ افسوس ہے کہ شادی کے محرکات وغیرہ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم، جتنا اس خط میں دیا ہوا ہے ”میری شادی مرحوم چیف جسٹس فورسٹر کی لڑکی سے ہو گئی، جسکا مزاج اور طبیعت کی افتاد ان تمام چیزوں سے زیادہ میرے لیے دلکش ہے، جو میں اُسکے سارے ہجنس طبقہ میں پاتا ہوں“ چونکہ برکھے خود برمودا زکوکارو بار کے شور و غل سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے

یہ فارہ امریکہ سے بہ نسبت برمودا کے بہت قریب ہے۔ کوئی ڈیرٹھام کیل کے فاصلہ پر ہوگا۔

مناسب یہ خیال کیا کہ رہوڈ میں ایک جائداد خرید کر وہاں کچھ تجارت اور صنعت کے پیشہ ورون کو آباد کر کے برہوڈا سے لین دین اور آمد و رفت کے تعلقات قائم کر دے تاکہ کالج کے ضروریات یہاں سے مہیا ہوتے رہیں، اسی غرض سے اس نے اپنے ہمراہ بہت سے تجارت پیشہ اور صنّاع لے لیے۔ اس کے علاوہ اور مختلف قسم کا بہت سا سامان ساتھ تھا۔ میں ہزار کتابوں کا وسیع ذخیرہ تنہا برکے کی ملکیت کا ہمارا پر تھا۔

جزیرہ رہوڈ | غرض اس اہتمام اور ساز و سامان کے ساتھ ۲۹ ستمبر کے پہلے مہینے کی ۲۳ کو رہوڈ کے بندرگاہ نیو پورٹ پر برکے کا ۲۵۰ ٹن کا جہاز لنگر انداز ہوا۔ یہاں نیو پورٹ میں یہ ۵-۶ مہینے رہا۔ اس کا حسن خلق، مذہبی بے تعصبی و تحمل اس قدر مشہور ہو گیا تھا کہ ہر مذہب و فرقہ کے لوگ کثرت سے اسکے وعظون میں شریک ہوتے تھے۔ یہ کبھی کبھی یہاں کے باشندوں اور دیہاتیوں کے جھوڑوں میں اُن کے عادات و خصائل کے مطالعہ کے لیے بھی نکل جایا کرتا تھا۔ اصل بری امریکہ غالباً ایک آدھ بار سے زیادہ جانے کی نوبت نہیں آئی۔ یہ جگہ اسکو اتنی بھائی، کہ ۱۲-جون کے خط میں مام کو لکھا ہے کہ اگر چارٹر میں تغیر ہو سکے، تو میں اس جگہ کو برہوڈا سے زیادہ پسند کروں گا۔ اسی خط میں خبر دی ہے کہ میرے لڑکا ہوا ہے، جو خدا کا شکر ہے کہ جینے والا معلوم ہوتا ہے۔

دہائٹ مال | جولائی یا اگست میں برکے، رہوڈ کی اصل دادی میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اُس نے ایک وسیع قطعہ زمین خرید کر اچھا خاصا مکان بنالیا۔ جس کا نام شاہان انگلستان کے قصر کی یادگار میں دہائٹ مال رکھا۔ اس کے آثار شاید اب تک موجود ہوں، یہاں اسکے دو سال انتہائی اطمینان و سکون کے ساتھ بسر ہوئے ہوں گے، مکالمات السیفار انہی پر امن ایام کی یادگار ہیں، یہاں کے باشندے بیان کرتے ہیں، کہ وہ اکثر بھاڑی

کے ایک کھوہ میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر ایسی سفارن کے لیے مطالعہ کیا کرتا تھا، اس کتاب میں جا بجا بیان کے مناظر بھی ملتے ہیں۔ وائٹ ہال میں قرا لیگز ہونے کے بعد اس نے نیو پورٹ میں ایک فلسفیانہ مجلس قائم کی، جہاں کچھ لوگ اس کو اپنے مذاق کے زندہ رکھنے کے لیے لمبے لمبے سال میں دوبار اس کے مکان پر گرد و نواح کے مشنریوں کا اجتماع ہوتا تھا، جو اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے باہم گفتگو و تبادلہ خیالات کرتے تھے، اور برکے کے قیمتی مشورون سے مستفید ہوتے تھے، امریکہ کا مشہور عالم و متکلم سیمول جانسن نے جو آگے چل کر نیویارک کے کنگ کالج کا پہلا پریسیڈنٹ ہوا، کئی بار وائٹ ہال کا حج کیا، برکے سے تلمذانہ استفادہ کرتا تھا، اس کے فلسفہ کا پوری طرح قائل ہو گیا تھا، اکثر اپنے شکوک اور علمی و شواہد کو مراسلہ کے ذریعہ سے رفع اور حل کیا کرتا تھا، چنانچہ اسکے نام برکے کے جو خطوط ملتے ہیں، وہ تمام تر اسی قسم کے مباحث سے لبریز ہیں کہا جاتا ہے کہ جانسن کی مشہور تصانیف برکے ہی کے خوان علم کی زلہ ربانیان ہیں، امریکہ کے اور علماء الکلیات میں بھی مبادی کا فلسفہ بہت مقبول ہوا۔ جانتھن آڈورڈی، جو اس زمانہ کا نہایت دقیق النظر عالم فلسفہ خیال کیا جاتا ہے۔ برکے ہی کی آواز باز گشت ہے۔

لیکن ان تمام مصر و دیتون اور دلچسپیوں کے باوجود ہمارے دین کا سارا دل اپنی اسکیم برمودا میں لگا ہوا ہے، لندن کے احباب کو برابر لکھتا رہتا ہے کہ سرکاری عطیہ وغیرہ کے حصول میں جلدی کرنی چاہیے، اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کی زندگی کا یہ ڈراما ٹریجڈی ثابت ہوگا، سب سے پہلے غالباً ۱۸۹۰ء کے آخر ہی میں اس کو لندن کے ایک دوست نے خط میں اشارتاً اتنا لکھا تھا کہ میں ہزار پانچ سو روپے وعدہ کی محکو بہت کم توقع ہے۔ اس یاس انگیز اطلاع کا غالباً کوئی دیر پا اثر نہ پڑا ہو۔ لیکن سال بھر سوزاؤ

کے پیملٹ دُئل اور انتظار کے بعد مارچ ستمبر میں پرائر کو جو خط لکھا ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس پر بھی یاس چھا چلی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ ”باوجود اپنے مقاصد میں تاخیر اور مایوسیوں کے خدا کا شکر ہے، کہ تمکین کے لیے دو منزلی راجتین حاصل ہیں، ایک میری بی بی، اور ایک بچہ، جو ہر طرح میری توقعات سے بڑھ کر اور میری آرزوؤں کے عین مطابق ہے۔“ اسی خط میں لکھا ہے کہ میرے حساب میں میری بی بی کی دایہ کی لڑکی کی پرورش کے لیے دو گنی سالانہ میری بی بی کی بھانج کو دیدیا کرو۔ تاکید جانو کہ کار خیر ہو۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی فیاضی اور مخیری بھائی بندوں ہی تک محدود نہ تھی، پھر، مئی کے خط میں ہر طرح کی کوششیں کرتھکنے کے بعد لکھا ہے کہ ”صاف صاف انکاری جواب مل جانے کے بعد میں نے وطن کی مراجعت کا قطعی تہیہ کر لیا ہے، کیونکہ اس کو میں ذرا بھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتا کہ باہر رہ کر ڈینری کے تعلق کو قائم رکھوں۔“ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ یہ اپنے منصب ڈینری سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا۔

بالآخر غالباً ستمبر کے آغاز میں لندن کے بشپ گبسن نے بہ ہزار خرابی وزیر اعظم، والپول سے یہ دلچپ اور آخری جواب حاصل کیا ”اگر آپ مجھ سے بہ حیثیت میرے وزیر ہونے کے دریافت کرتے ہیں، تو میں یقین دلاتا ہوں، کہ جیسے ہی پبلک مصلحت موقعہ دیگی قطعاً روپیہ دیا جائیگا، لیکن اگر آپ بہ حیثیت دوست کے یہ پوچھتے ہیں کہ ان میں ہزار پاؤنڈ کے انتظار میں ڈین برکلے کو امریکہ میں پڑا رہنا چاہیے یا نہیں، تو میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے توقعات کو خیر باد لکھ کر وطن واپس آجائیں۔“ یہ ستم ظریفانہ جواب تو ہمارے ڈین کو وسط اپریل سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ لیکن ستمبر سے پہلے وہ سواحل امریکا کو نہیں چھوڑ سکا، خدمت مذہب و انسانیت کے اُس خرمن صد شوق و آرزو کے ساتھ، جو دس سال سے

فراہم کیا جا رہا تھا، وزیر اعظم برطانیہ کے ان فقرات نے جس برق افگنی کا سلوک کیا ہوگا ہم اس کا کسی طرح اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ برکے کی تقریباً ہفتاد سالہ زندگی کا کوئی سانحہ اتنا درد انگیز اور دل خراش نہیں ہو گا۔ گونا گون زحمت کشیوں، مالی نقصانات اور اضاعت وقت کے بعد اس کے پاس اگر تسکین اندوزی کا کوئی سرمایہ تھا، تو نکالنا ایسٹھارن اور وائٹ ہال کے وہ پر امن و با فراغت ایام جو اس نے دنیا کی پر شور زندگی اور کشاکش سے آزاد رہ کر فکر و مطالعہ کی عالم فراموشی ذہنی لذتوں میں بسر کئے جس کا اظہار اُسے ایسٹھارن کی پہلی ہی گفتگو میں کیا ہے، حکیم عرفی نے سچ کہا ہے کہ

نقد ہر سود در جیب زیان انداختیم

لندن واپس | بہر کیف ساڑھے تین سال کی غیوبت کے بعد فروری ۱۹۳۲ء میں ہم دین برکے کو مع بی بی اور بچہ کے لندن میں پاتے ہیں، جہاں دو سال سے زیادہ قیام رہا، مارچ میں مکالمات ایسٹھارن کا پہلا ایڈیشن جس کے ساتھ نظریہ رویت بھی شامل تھا، نکلا، اس میں انھیں مدعیان آزاد خیالی کے مقابل میں مسیحیت یا مذہب کی حمایت کی گئی ہے، جنکا ذکر مضامین گارجین کے ذیل میں اور گزر چکا ہے، یہ اس قدر جلد ہاتھوں ہاتھ پبلک میں پھیل گئی کہ اسی سال دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا، لیکن اس کتاب کی اشاعت نے برکے کی مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ کثرت سے لوگوں نے تردیدیں بھجائیں۔ بشپ براؤن نے جیسٹھارن میں بعض بعض جگہ حملہ تھا، ایک نہایت ضخیم کتاب لکھ ڈالی، جس کے تقریباً دو سو صفحے صرف برکے کی تردید کے لیے وقف کر دیے لیکن اس نے اس تمام طوفان میں صرف اس ایک گناہ مرسلہ کی جاب اٹھانکلیا، جو روزانہ اخبار ڈیلی پوسٹ ہوائے میں نکلا، اور جس کا تعلق نظریہ رویت سے تھا

اس خلافِ عادت اعتنا کا سبب برکھے نے خود ہی جانسن کے ایک خط میں بیان کیا ہے ”بشپٹ
کارک کی کتاب اور وہ دوسری کتاب جس کا مصنف بیکسٹر نامی کوئی شخص شاکی جانب یہاں
لوگوں نے بہت ہی کم التفات کیا ہے“ اس لیے میں نے پبلک میں ان پر کوئی توجہ نہیں
کی۔ جن اعتراضات کا جواب اصل کتاب میں دیا جا چکا ہے ان کا پھر جواب دینا اور ایک
ہی بات کو بار بار دہرانا غیر ضروری اور نامطبوع و دونوں تھا۔ ”نظریہ رویت والا مراسلہ اگر
اخبار میں نہ چھپتا، جسکی وجہ سے تمام ملک میں پھیل گیا، تو میں اُس پر بھی توجہ نہ کرتا، اس کے علاوہ
”نظریہ رویت بعض آدمیوں کے لیے کسی قدر گنجلک بھی تھی، اس لیے ابک موقع پا کر اسکی
تشریح کر دینا مجکو ناگوار نہیں گذرا“ اس جواب کا عنوان ”تشریح و اثبات نظریہ رویت“ تھا

آرزو سے عزت اور ہوٹے سے واپس ہوتے ہی برکھے کی تندرستی میں گھٹن لگ گیا تھا، جس میں
برمو وائیکم کی ناکامیوں کا کچھ کم حصہ نہ تھا، ٹام کے خط میں لکھا ہے کہ ”منضبط زندگی اور صحیح خیر
کی بدولت (جو دنیا میں مجھ کو سب سے عمدہ چیز معلوم ہوتی ہے) بہت کچھ سنبھل گیا ہوں یہاں تک کہ
گو ابھی پڑھ لکھ نہیں سکتا، لیکن خیالات میں دیسی ہی صفائی آگئی ہے جیسی کبھی پہلے تھی، لہذا تقریباً
صبح کا وقت ریاضی کے بعض مسائل پر غور و فکر میں گذارتا ہوں، ممکن ہو کچھ نتیجہ نکل آدے“ یہ نتیجہ
انالٹ ہے، جسکا اھصل یہ ہے کہ ریاضی کے اصول اولیہ اور مبادی بھی اسی طرح انسان کے
لیے ناقابلِ فہم ہیں جس طرح مذہب کے، لہذا مذہب کو صرف اس بنا پر نہ ماننا کہ اسکے مبادی فوق
الفہم ہیں، محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسکی اشاعت کے انگلستان کے تمام مشاہیر علماء ریاضیات
کو نفل برائش کر دیا اور بیسیوں مضامین و رسائل مخالفت میں لکھ ڈالے گئے، ابھی پوری طرح
سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ نقرس کا حملہ ہوا، جو زندگی کے ساتھ گیا۔ سن بھی انخطاط کا آچکا تھا۔ ان
اسباب نے عزت و خانہ نشینی کی آرزو غالب کر دی، چنانچہ ۱۸ جنوری ۱۸۳۷ء کے خط میں

نام کو لکھتا ہے کہ ”اب میرے تمام حوصلوں پر صحت کا خیال اور عزت کی تمنا غالب ہے“

منصب بشپ | خوش قسمتی دیکھو کہ ۱۹ ہی جنوری کو اس متمنی راری کا بہترین سامان نکل آیا، ڈین برکے کو یکایک یہ اطلاع ملی کہ وہ کلاٹن کا بشپ برکے ہو گیا، یہ جگہ اسکی گوشہ نشینی کے اعمال کے لیے اتنی موزون تھی کہ وہ خود بھی اس سے بہتر نہیں تصنیف کر سکتا تھا، اور حکومت نے اس ذریعہ سے ایک حد تک برمودا کی مایوسیوں کی اشک شونی کر دی، لیکن خرابی صحت کی وجہ سے پہلے برکے لندن کو نہ چھوڑ سکا۔

عہد انخطاط و عزت

(۱۸۳۲ تا ۱۸۵۲ء)

۱۹ مئی ۱۸۳۲ء اتوار کے دن سینٹ پال چرچ (ڈبلن) میں بشپ کے مقدس منصب پر برکے کی سرفرازی کے باقاعدہ تمام مراسم ادا کیے گئے، یہاں ہفتہ عشرہ ٹھہر کر اس نے سیدھی کلاٹن کی راہ لی، یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جسکی ابریشیہ (بشپ کا ماتحت ملکہ) میں ۴۴ گرجے اور ۱۴ ہزار پروٹسٹنٹ آبادی شامل تھی، رومن کیتھولک چرچ دو گنے تھے اور انکی آبادی بھی ۱۸ ہزار سے زائد تھی۔ خود بشپ کا اقامت گاہ کلاٹن کے دیہات میں واقع تھا، جو خاموش مطالعہ اور عزت کی زندگی کے لیے بہ غلط سے موزون تھا۔ برکے یہاں پہنچ کر بالکل خانہ نشین ہو گیا۔ ۱۸۱۶ء سال کی طویل مدت میں کل ایک بار ۱۸۳۲ء میں اپنی ابریشیہ سے باہر قدم نکالا، وہ بھی صرف ڈبلن تک اور ایک مذہبی فتنہ کے فرو کرنے کے لیے (جس کا ذکر آگے آتا ہے) کلیسائی فرائض کی انجام دہی کے علاوہ ابتدا میں صبح کے اوقات کا بڑا حصہ فلاطون دھڑک

لے رچرڈ ہورک (۱۵۵۳-۱۶۰۰) کی مشہور کتاب ”سیاست دینیہ“ ہی چھلے اس غلامین یونانی خیالات خصوصاً فلاطون کا شیلہ کی ہور تھا۔ ہورک کے لٹریچر کی جان بھی یہی یونانی خیالات ہیں اسلئے غالباً وہ برکے کو مرغوب رہا ہو گا۔

کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، انالسٹ کی اشاعت سے علمائے ریاضیات میں جو آگ لگ گئی تھی اسکے شعلے اب تک جا بجائے اُٹھ رہے تھے، ڈاکٹر جوران نامی ایک مشہور شخص نے اسکا رد لکھا، ڈبلن کے ایک اور عالم ریاضیات والٹن نے بھی اسپر شدید حملے کیے، برکلی نے ان دونوں کا جواب مستقل رسالوں میں دیا، جو دلائل کی قوت کے ساتھ نہایت شوخ چوٹوں کی چاشنی بھی رکھتے ہیں۔

خدمتِ وطن | سلسلہ بیاریون اور علی زندگی کی مایوسیوں نے برکلی کو خانہ نشین بیشک کر دیا تھا، لیکن جس شخص نے ملت و انسانیت کی خدمت کے پیچھے گھر بار، احباب و اعزہ کو سچ کرئی دنیا کا ایک گوشہ جا بایا تھا، اسکی خانہ نشینی کے یہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے تھے کہ وطن میں رہ کر اہل وطن کی تباہ کاریوں کا تماشہ بیٹھے بیٹھے دیکھا کرے، اُس زمانہ میں آئرلینڈ کی اجتماعی اور عمرانی حالت نہایت ہی پست تھی معاشرت کے ادنیٰ لوئی اصول سے یہاں کے باشندے بیگانہ تھے، مذہبی اور اخلاقی تنزل اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا مختصر یہ کہ زندگی کا ہر پہلو محتاج اصلاح و تجدید تھا، خود برکلی جانسن کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ ”مادی اور روحانی دونوں حیثیات سے کار خیر کے لیے یہاں نیو انگلینڈ (امریکہ) سے دس گنے زائد مواقع موجود ہیں۔“

لا مذہبی کی روک تھام | برکلی نے ان تمام حالات کا نہایت تعمق سے مطالعہ کر کے سب سے اول تنزل کے اسباب اور وسائل اصلاح کا استقصا کیا، اور دوبرس تک پیہم اپنے خیالات کو مختلف عنوانات سے ملک کے سامنے پیش کرتا رہا، مذہب سے عام بے التفاتی اور بد دینی کی روز افزون اشاعت کی جانب ارباب حکومت کو توجہ دلائی، اور یہ دکھلایا کہ مذہبی عقائد و خیالات کا انسان کی زندگی اور اعمال پر نہایت عظیم الشان اثر پڑتا ہے، آدمی کا چال

چلن اس کے عقائد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے مذہب و اخلاق کے اُن عقائد کی حفاظت، جو بدکاری سے بچاتے اور نیکو کاری کی طرف مائل کرتے ہیں، حکومت کا اولین فرض ہے، کسی حکمران کا یہ کہنا کہ ”لوگوں کے اعتقادات سے بحث نہیں، میں صرف ان کے اعمال کی پردہاہ کرتا ہوں“ اپنی کمزوری کا اظہار ہے۔ ”ڈبلن میں ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی، جو فسق و فجور اور الحاد و زندقہ کی علانیہ تعلیم دیتی تھی، انتہایہ کہ اسی کام کے لیے ایک باقاعدہ سوسائٹی بن گئی تھی۔ برکلی نے ان شیاطین کی صرف تحریری پردہ دری پر قناعت نہیں کی بلکہ ڈبلن جا کر کئی مہینے قیام کیا، اور لاٹم بشپ کی حیثیت سے دارالامرائے متعدد اجلاسوں میں شریک ہو کر ان کے خلاف نہایت بڑے تقریریں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کو ایک کمیشن بٹھانا پڑا، جسکی تحقیقات سے عجیب عجیب ناقابل اعادہ ابلیس کاریوں کا انکشاف ہوا، اور بالآخر ان معلمین فسق و فجور کو اپنے کردار کی قرار واقعی پاداش بھگتنا پڑی۔

اقتصادی اصلاحات | بے شک ایک ایسی جمعیت کی بنجیٹی جسکے وجود کی غایت ہی تعلیم فسق و فجور ہو، نہایت عظیم مذہبی، اصلاحی فرض تھا۔ لیکن برکلی ہمارے آجکل کے مولویوں کی طرح زرا بشپ نہ تھا کہ چند بد زبان ملاحدہ کے خلاف صرف تقریر و تحریر یا حکومت کے زور سے انکی زبانوں کا بند کر دینا ہی دینی خدمات کی معراج سمجھتا۔ وہ ابنائے وطن کی عمرانی و اقتصادی فلاح اور انکی مادی رفاه کو بھی اصلاح کے مہمات اعمال میں داخل جانتا تھا، چنانچہ اسے مستفسر (superintendent) کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا، جو ششہ سے ششہ تک تین قسطوں میں شائع ہوا۔ اس میں اُسے استفسارات کے پیرایہ میں تمام ان دقائق اقتصادیات کی تعلیم کی ہے جو آج فلسفہ معیشت یا علم الاقتصاد کے بنیادی اصول ہیں۔ مل نے بعض استفسارات کی نسبت لکھا ہے کہ ”اگر برکلی اس نظریہ

کی تکمیل کر دیتا تو آج آدم آسمتھ کا پیشرو ہوتا، اتنا ہی نہیں بلکہ نہایت کاوش و جانفشانی سے اس نے اپنے
 عہد کے تمام ترقی یافتہ ممالک کی صنعت و تجارت کے اعداد و شمار مہیا کیے ہیں اور ایک ایک کے
 بتلایا ہے کہ آئرلینڈ کی درآمد و برآمد کیا ہے، اس پر بیرونی تجارت کا کتنا تسلط ہے۔ سیکڑوں مصنوعات
 جو اجنبی ممالک کے بازاروں سے حاصل کیے جاتے ہیں، خود وطن ہی میں تیار کیے جاسکتے ہیں
 یہ اعدادی تحقیقات آجکل کچھ زیادہ شکل کام نہیں معلوم ہوتا، لیکن دو سو برس پہلے اتنا آسان نہ تھا۔
 ”مستفسر“ یہ استفسارات اگرچہ اٹھارھویں صدی میں حکومت و باشندگان آئرلینڈ کو مخاطب
 کر کے لکھے گئے تھے۔ لیکن ان کا اکثر حصہ آج بیسویں صدی میں ہندوستان کے حالات کے ہند
 مطابق ہو کر صرف نام کے بدل دینے کی ضرورت ہے، اس ۵۰-۶۰ صفحہ کے مختصر مجموعہ میں ہر
 ملک کے ذائیان وطن اور مدعیان ملت پرستی خصوصاً مسلمانوں کے لیے بیسویں اسباق و بصائر
 و دلالت ہیں، افسوس ہے کہ ان استفسارات پر کوئی بسیط بحث و تبصرہ زیر تحریر کتاب کے موضوع
 سے خارج ہو، پھر چند اقتباسات درج کیے بغیر کسی طرح آگے نہیں بڑھا جاتا۔

۲۲۔ کیا تھوڑا روپیہ جو کاروبار میں لگ کر چکر کھاتا رہتا ہے، نتیجہ میں اس کثیر روپیہ کے سادہ بین ہو چکی
 گردش سست ہوتی ہے؟

۲۳۔ کیا روپیہ کی اصل حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہو کہ وہ ایک طرح کا ٹکٹ یا نشانہ ہو؟ (دینہ منہ بیعت کے
 دقیق نکتے ہیں)

۲۴۔ اگر دولت کا حقیقی سرچشمہ محنت ہے تو کیا ایک عقلمند حکومت کا فرض نہیں ہو کہ کاہلی کے اسباب و محرکے
 ۵۳۔ مجرموں کو امریکہ وغیرہ جلا وطن کر دینے کے بجائے کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں نکالی جاسکتی کہ وہ رفاه عام
 کے لیے مفید بنائے جاسکیں؟

لے اقتصادیات کا نامور عالم اور مدون جسکی سب سے مشہور کتاب ”ثروت الامم“ یا دولت اقوام ہے۔ انگلستان (۱۷۲۳-۱۷۹۰)

۵۶۔ کیا یہ صحیح ہو کہ لائنڈمین غربا کے لیے اپنی محنت و مشقت کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہو اور پھر بھی وہاں کی

گلیوں میں کوئی گداگر نہیں ملتا۔ ۹

۵۷۔ کیا وہ شخص جسکی عیش پرستی بیرونی مصنوعات کو منظم کرتی چلی جاتی ہو اور جسکی جفاکشی مبادلہ کے لیے کوئی

ایسی صنعت مہیا نہیں کرتی، ملک کے لیے ایک عذاب نہیں ہے۔ ۹

۶۵۔ اگر فرانس اور فلینڈرس میں منقش، ریشمی مصنوعات لیس وغیرہ کی تعلیم کے لیے مدارس نہ ہوتے

تو کیا پھر وہ بھی انگلستان سے اتنا روپیہ کھینچ سکتے تھے؟

۶۹۔ کیا فرش و فرش بنانے سے جلد تر کوئی صنعت سیکھی جاسکتی ہو؟ اور کیا ہماری عورتیں تھوڑی

مدت اور زحمت میں اُن سے زیادہ خوبصورت دری قالین وغیرہ نہیں بنا سکتیں جوڑکی کرتے ہیں؟

۱۰۲۔ جو لوگ اجنبی ممالک کے مشروبات کا استعمال کرتے ہیں اور وہاں کے سامان آرائش کو اپنے بال بچوں کو

آماتہ کرتے ہیں کیا وہ اسکے مستوجب نہیں ہیں کہ ان کا شمار اجانب میں ہو؟

۱۴۰۔ کیا ہم اُس فیشن پرستی کی بدولت تباہ نہیں ہو رہے ہیں جو کسی اور قوم کے لیے زیبا ہو؟ اور کیا مفلس

قوم کے لیے دولت مند قوم کی نقالی جنون نہیں ہے؟

۱۶۹۔ کیا ملک اس حال میں پنپ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کا گوشت تو بیاہر بھیجا جاتا ہو اور خود ہمارے

مزدور آلوؤں پر زندہ رہتے ہیں؟

۲۱۷۔ کیا دولت مندی کا ایک حقیقی اساس جفاکشی اور میانہ روی کے سوا اور کچھ ہے؟ کیا جفاکشی اور جوہر

ذاتی کے علاوہ تحصیل دولت کے اور تمام وسائل کا سبب نذر دنیا چاہیے؟

۲۴۸۔ کیا مذہبی آزادی کے موضوع کو بالائے طاق نذر دنیا چاہیے؟ اور کیا ہمارے آزادیخواہوں کے

لیے اب وقت نہیں آگیا ہے کہ اپنے تمام افکار کو ملکی ترقی کے پیچھے منہمک کر دیں؟

۳۲۶۔ کیا ہمارے اس جزیرہ کے لیے یہ بہتر نہ ہو کہ عیش پرست امرا و روسا جہاز میں بٹھا کر اجنبی ممالک

میں بھیج دیے جائیں اور وہیں رہیں بجائے اسکے کہ وطن میں رہ کر اچھی ممالک کے سامان قعیش پر اپنی پائتین

برباد کریں اور یہ مرض تمام سرزمین وطن میں مقعدی ہو،؟

۳۶- کیا لیڈرون اور وطن پرستوں کے لیے اس سے زیادہ کوئی نئی مستوجب ملامت ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو روزگار

میسر نہ آتا ہو؟ اور کیا ایسے وسائل نہیں اختیار کیے جاسکتے، جسے لنگرے، لوے، اندھے اور بہرے تک

بے روزگار نہ رہ سکیں اور ضاعی کی کسی نہ کسی شاخ سے اپنی روزی حاصل کر سکیں؟

۵۱۵- کیا ایک نائنین فرانس صرف سوئی کپڑوں کی بدولت اسپین سے آٹھ ملین سالانہ نہیں گھٹتا تھا؟

۵۱۸- کیا قریباً ۱۲ سال پہلے اسپین کو سوئی کپڑوں کی تجارت میں ہمارا بھی مقول حصہ تھا؟ کس چیز اس کو فنا کیا؟

مقالہ بنام حکام ^{وغیرہ} مقالہ بنام حکام ”اور اصول و طینت“ وغیرہ کے مختلف عنوانات سو برکلے نے اس قسم کی سبق

آموز تحریری خدمات اور تنبیہات کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آخر دم تک جاری رکھا، اگر اسکے مقولے فطرت بشری کی رمز

شناسی اور حرکت سے ملو ہوتے ہیں، وہ جانتا ہے کہ کوئی بشر بشر رکھ اپنی ذاتی بھلائی یا اغراض سے قطع نظر کبھی

نہیں کر سکتا، اس لیے وہ ”اصول و طینت“ میں حقیقی وطن پرست کی پہچان یہ بتلاتا ہے کہ

۲۶- وطن پرست اپنی ذاتی فلاح کو ناہ عام کا اندر تلاش کرتا ہے لیکن ایک خود پرست مکار رفاه عام کو اپنی

ذاتی اغراض کا غلام اور ماتحت قرار دیتا ہے۔ اول الذکر اپنی حیثیت ایک کل کے جز کی سمجھتا ہے۔ اور

آخر الذکر خود اپنے ہی کو کل سمجھتا ہے۔

رومن کی تھلاک پادریوں کے نام اکیل پیل شائع کیا ہے جس میں ان سو درخواست کی ہے کہ اپنی اتباع

کو محنت و مشقت کا عادی بنائیں اور جمہوریت سے نفرت دلائیں اسکے لیے طرح طرح کے موثر مسالیت کام لیا ہے۔

ساری کائنات فطرت کا ہلون کے خلاف دلائل و امثال سے پُر ہے۔ سلیمان نے فرمایا کہ ”ادجول جاوور

اور چنیوئی کو دیکھ“ چونی، ماکھی BEETLE اہ تمام حشرات الارض، بجز ز ماکھی کے جس کی نسبت

مشہور ہے کہ دوسروں کی مشقت سے پیٹ پاتا ہے) انسان کے لیے جفاکشی کے اسباق کی کتاب ہیں.....

بس جب کابل آدمی کسی مصروف کانینن تو *stence* کا کوئی حق نہیں (پنیر کا
فرمان ہے) لوگوں سے کہو کہ کام کریں اور اپنی کمائی کی روٹی کھائیں، گدائی کی روٹی نہیں،
دوسروں کے پسینہ کی کمائی ہوئی روٹی نہیں، بلکہ خود اپنی روٹی جو اپنی مشقت سے پیدا ہوئی
ہے.....“

یقیناً بونا جو تانا ایک ایسی ورزش ہے جس کی لطف بخشی، نفع بخشی سے کم نہیں ہے یہ کاشتکار
کو اپنے جھونپڑے سے نکال کر تازہ ہوا اور کھلے میدان میں لیجاتی ہے جسکی بدولت اسکی قسمت اس
بجول آدمی سے بہت زیادہ قابل رشک بنجاتی ہے، جو پال پر رہتا ہے یا دن دن بھر آگ
کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔“

ایک آئرش جب کام کرتا ہوتا ہے تو حالت یہ ہوتی ہے کہ جہاں کوئی گاڑی یا گھوڑا پاس
سے نکلا تو وہ قطعاً اپنا کام بند کر دیکھا اور جب تک آنکھ سے اوجھل نہ ہو جائے کھڑا ہو کر دیکھتا رہیگا۔ سیر ایکٹوئی
نے لندن سے برشل تک کے سفر میں اسکو محسوس کیا کہ جس مزدور سے راستہ دریافت کرتا تھا وہ بے ادب دیکھے
اور کام کا ہرج کی جواب دیتا تھا، ہر ایک کے لاپرواہی کدال کو سہا کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا اور یہ ایک آئرش نکلا۔

”مقالہ بنام حکام“ میں حکومت کے فرائض اور تعلیم کے صحیح معیار کی نسبت لکھا ہے کہ
انسان ایک ایسا حیوان ہے جسکی عقل و جذبات دونوں نہایت خوفناک ہیں اس کے جذبات اسکو ہڑیوں پر
آمادہ کرتے ہیں اور عقل انکے حصول کی تدبیریں سکھاتی ہے۔ اس سرکش حیوان کو ہلاک اور مخر بنانا اس
میں عدل اور نیکی کاری کا ملکہ پیدا کرنا اس کو بذریعہ توفیق بری راہوں سے دور رکھنا اور اسید و سکے
ذریعہ سے واجبات کی سرانجامی میں اسکی ہمت بڑھانا مختصر یہ کہ اسکو سوسائٹی کے قابل اور اہل بنادینا، یہی
سیاسی اور مذہبی تعلیمات کا مقصد اور ہر زمانہ کے حکماء و صلحا کی مساعی کا منتہی ہے اور اسی مقصد حصول کا
موزن ترین نظام ہمیشہ صحیح تعلیم سمجھا گیا ہے۔“

انسان کے اعمال اس پر عجز و زور دیا ہے کہ انسان کے اعمال اخلاق بہت کچھ اُسکے خیالات عقائد و رسوم ہی کا
 اسکے
 خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں نتیجہ ہوتے ہیں ایسے صحیح اور مفید اعتقادات کا پھیلاؤ اور انکی حفاظت حکومت کا سب سے مقدم فرض ہے

”انسانی حالات کی نوعیت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ تو قطعاً ناممکن ہے کہ تمام عوام الناس فلسفی نجائیں یا
 تمام چیزوں کو انکے علل و حقائق کی بنیاد جاننے لگیں، ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ ایک دو کار کو اپنا حساب کھنے
 کے لیے، ایک طاح کو جہاز رانی کے لیے، ایک نجار کو لکڑی کی پائش کیلئے صرف ایک بندھو ہوتے تو اعدیا
 Conclusions ہی کافی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اصول یا نظریات یعنی صاحب اقلیدس

کے مابانی و دلائل کو نہیں سمجھتا۔ یہی حال اخلاقی سیاسی اور مذہبی معاملات میں بھی ہے، یہ ایک بالکل
 کھلی ہوئی بات ہے کہ جو عقائد و خیالات ابتدائے عمر میں غافلانہ طور پر سمجھے جاتے ہیں
 بے اسکے کہ انکی اصل حکمت کی ادنیٰ جھلک بھی دکھلائی جائے، وہ بھی عمدہ نتائج پیدا کرتے ہیں اور دنیا کے
 لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں یہ حقیقت ہر شخص پر گردش کے روزانہ مشاہدات سے روشن ہو سکتی ہے“
 ”جو خیالات شروع ہی میں آہستہ آہستہ ذہن میں داخل کر دیے جاتے ہیں وہ سب پہلے اپنا اثر جاملتے

ہیں اور جڑ بکرجاتے ہیں پھر اس حیثیت سے کہ وہ انسانی افعال کا حقیقت سب سے بڑا جزو ہیں، اُسکے چلکر
 بالعموم انسان کی زندگی کو مڑا پاپا اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ انسان کے افعال کے اصلی محرکات دو

قوت اور قوت نہیں ہیں بلکہ وہ خیالات جو ان چیزوں کی نسبت اُس کے دل میں قائم ہو گئے ہیں۔

لہذا کسی مجسٹریٹ کا یہ کہنا کہ کچھ مضائقہ نہیں لوگ جس قسم کے خیالات چاہیں رکھیں، بلکہ صرف اُسکے

افعال کو سروکار ہے، اسکی کمزوری کی دلیل ہے، کیونکہ آدمی کے جیسے خیالات ہوتے ہیں

ویسے ہی اسکے افعال ہونگے۔“

ایک دقیق نکتہ جس جملہ کو ”اوپر کی عبارت میں ہم نے خط زد کر دیا ہے، اُس میں جو نکتہ برکھلے کے

قلم سے نکل گیا ہے، اُسکی قدر کسی دقیق النظر عالم نفسیات اور فطرت بشری کے رمز شناس پوچھیے، عام طور پر

لوگ سمجھتے ہیں کہ انسان طرح طرح کی عیاریاں اور عرق ریز کوششیں مال و جاہ کی طلب میں کرتا رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل محرک وہ خیال ہے جو کسی کے دل میں مال و جاہ کی برتری کی نسبت بیٹھ گیا ہے، چنانچہ اگر کسی کے ذہن میں عزت و ثروت کی وقعت نہ ہو تو وہ اس کی طلب کے کچھ بھی جان نہ دیکھا لیکن تم جانتے ہو کہ ہر کلمے ہماری قومی مجالس کے اسٹیج کا تماشا گر نہیں تھا کہ صرف باتیں بنا کر تسکین و فاعلت حاصل کر لیتا۔ وہ جو کچھ کہتا تھا خود بھی اس پر عمل کی کوشش کرتا تھا۔

صنعت و حرفت کی علامت افزائی | حیرت اور استعجاب کی حد نہیں رہتی کہ ایک فلسفی اور بشپ ویسے صنعتی
سوت کا کارخانہ اور پیداوار کی ترویج و بہت افزائی کے لیے خود ہی سن کی کاشت کرتا تھا اور سوت

بنانے کے لیے ایک بڑا کارخانہ کھول رکھا تھا، باوجود نفاست پسندی کے وطن ہی کی بنی ہوئی بری بھلی چیزوں کو استعمال کرتا تھا اور بیرونی مصنوعات سے انقطاع کر لیا تھا، صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی جانب اتنی توجہ تھی کہ کہا جاتا ہے کہ "آئرلینڈ میں موسیقی اور مصوری ہر کلمے کی گھر سے رواج پذیر ہوئی" اس کا مکان دار الفنون (آرٹ گالری) مشہور تھا، ہفتہ وار موسیقی کی ایک بزم اسکے ہاں منعقد ہوتی تھی جس میں محلہ کے لوگ بھی مدعو ہوتے تھے، اپنے بچوں کو موسیقی سکھانے کے لیے اطالوی ماسٹر نوکر رکھا تھا۔ خود مصوری وغیرہ کا اقدانہ ذوق رکھتا تھا۔ ماس پر اُرنے کے لیے تصویروں بھیجیں، تو ان پر نشانے فن کی طرح تھیکہ کرتا ہے تیسری تصویر نقلی اور بدنگ ہے..... عورت والی تصویر اچھی بنی ہو لیکن اطالوی قلم کی مہارت و حسن کو نہیں پہنچی....."

جن مساعی میں دماغ و دل ہاتھ اور قلم سب برابر کے شریک ہوں وہ ماسٹران کیسے جاسکتی تھیں۔ چنانچہ اس صدی کے وسط میں آئرلینڈ کے حالات میں عظیم تغیر ہو گیا، اور آج اس سرزمین میں زندگی کی جدوجہد کی جو گرم بازاری ہے اُس میں ہماری لارڈ بشپ اور مستفسر کے مصنف کا کم حصہ نہیں ہے،
نقد و بابا ۳۹ کے آخر میں اتنا شدید پالا پڑا کہ دیا جم گئے، جسکی بدولت لازماً قحط پڑا اور ایسا شدید

پڑا کہ گیون کا رخ ۲۴ شلنگ فی کلوڈ رکن تک پہنچ گیا، جو پھر کمین دو برس بعد جا کر ۱۶ شلنگ پر اترا ہزاروں آدمی فاقے سے مر گئے، ساتھی اسہال اور وبا کی بجائے اس پاس کے تمام مقامات میں پھیل گیا۔ جو سالہا سال تباہی کا باعث رہا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس انسانی مصیبت میں انساے جنس کے اُس ہمدرد پر کیا گذرتی ہوگی جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے زندہ تھا۔ اسے اپنے آرام و آسائش کی چیزیں ترک کر دیں۔ ہر دو شبہ کی صبح میں پاؤں ڈکلاٹن کے محتاجوں کو نقد تقسیم کرتا تھا۔ باورچی خانے سے کھانا بٹاتا تھا بے روزگاروں کو روزی سے لگانے کے لیے خود ہی زراعت شروع کر دی، ایک خط میں لکھتا ہے کہ ”اس انتہائی پُر آشوب زمانے میں ہم روزانہ سو سے زیادہ آدمی کھیتی باڑی کے کسی نہ کسی کام میں بھنسا رکھتے ہیں، جسکی دیکھ بھال میری بیوی کرتی ہے یہ ایک منفعت بخش کار خیر ہے“

طبی تحقیقات متعلق ماء القیر

اس اسہال دم اور بخار کی وجہ سے بپشپ فلسفی کی زندگی کا ایک اور بہت ہی عجیب کارنامہ تھا۔ اسے چھوڑا ہی۔ برکے جب امریکہ میں تھا تو وہاں اسے دیکھا تھا کہ چپک وغیرہ کے بعض امراض میں کوئی غیر معمولی عنصر حیات شامل ہے اور یہ تمام امراض کے لیے اکیسرا بت ہو کر رہیگا چار پانچ سال اسی دھن میں لگا رہا اور بالآخر ۳۷ء میں ایک ضخیم کتاب اسی موضوع پر لکھ ڈالی جسکا نام ”ماء القیر کے فوائد فلسفیانہ تفصیلات و تحقیقات اور بعض دوسرے باہم پیوستہ مباحث کا ایک سلسلہ“ تھا، اس کتاب کی اشاعت کا عالم ہوا کہ چند ہی مہینے کے اندر سرس کے نام سے دوسرا ایڈیشن نکلا۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ پرتگالی وغیرہ متعدد زبانوں میں ترجمے شائع ہو گئے، لندن میں ماء القیر کے کارخانہ کھل گئی۔ پیشہ ور اطباء کے دل نہیں رفاقت کی آگ لگ گئی ہومانوں نے اس سے کمین زیادہ مخالفت کا طوفان برپا کر دیا جتنا انا لست کی اشاعت

کے وقت علمائے ریاضی نے کیا تھا۔ لیکن اس مخالفت نے سرس کی اشاعت و قبول میں اور زیادہ مدد دی (اس کتاب کا تفصیلی ذکر تصانیف کے ذیل میں آگے آتا ہے) ایام عزلت کے آخری ۱۰، ۱۲ سال کا بیشتر حصہ اسی مادہ القیر کی تحقیقات اور مرصیون کے علاج و معالجہ میں گزرا۔ اگر ۱۹ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ ”مادہ القیر کے استعمال کرنے والے مرصیون کی مراسلتیں احباب سے مراسلت میں غیر منضبط بنادیا ہے اکثر تاخیر ہو جاتی ہے۔“

تقاعد و خودداری ۱۹ء میں آئرلینڈ کے جدید وائسرائے نے برکلی کی ان بے لاگ دطنی اور دینی خدمات کا اس طرح اعتراف کرنا چاہا کہ کلاسٹن کے بجائے کلونگھر کے بشپ کا منصب پیش کیا جس میں مالی منافع بہت زیادہ تھے، لیکن ملک قناعت کے بادشاہ کے لیے یہ ترغیب کیا حقیقت رکھتی تھی اسے صاف انکار کر دیا، کچھ دنوں بعد آئرش بشپ کی جگہ خالی ہوئی جو مناسبت کلیسائی کی معراج کمال ہے، احباب نے شدید اصرار کیا کہ وہ اس کے لیے اپنے کو پیش کرے۔ مگر اسکی خودداری اور بے نیازی نے صرف یہ جواب دیا کہ ”میں نہ تو آئرش بشپ کی نام کی عزت کا بھوکا ہوں، نہ دولت کا طالب ہوں، جسکو لندن کا ہر دوکاندار حاصل کر سکتا ہے۔“

اولاد کی تعلیم و تربیت برکلی کی ان مختلف الجہات مصروفیتوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خود کوئی توجہ نہ کر سکتا ہوگا۔ معمولی والدین کی طرح بچوں کو محض کسی اسکول کے ”مزدور معلمین“ پر چھوڑ دیا ہوگا، یا زیادہ سے زیادہ گھر پر کوئی میوٹر رکھ دیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عظیم پدری فرض کی نہ صرف اہمیت کا صحیح احساس رکھتا تھا، بلکہ ضعیف العمری اور دائم المرضی کی معذوریوں پر بھی اسے اسکی ادائیگی میں کبھی غفلت یا تقصیر نہیں کی جس کا اندازہ تم خود اسکی بیوی کے ایک خط سے کر سکتے ہو، جو اس نے شوہر کی موت کے بعد اپنے لڑکے کے خارج کو لکھا ہے:

”تمہارے پیارے باپ کی دانائی اور امان کی خبر گیری نے کیسی ہوشیاری اور احتیاط سے تمہارے

بچپن کو نبھالا۔ اپنی آرام کے لیے ہنسنے تکو بھی مزدور معلمین کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑا بچپن

میں تم خود اپنے باپ سے تعلیم پاتے تھے، وہ گو ضعیف العمر اور دائم المرض تھے، لیکن اس فرض

کو خود ہی انجام دیتے تھے، اور کسی دوسرے پر اسکو چھوڑنا نہیں رو رکھا، تم انکی مشغولیت

اور سرت تھے، کوتاہ نظر لوگ تعلیم کی معمولی اور ادنیٰ نذر نشون کو خطرناک نہیں سمجھتے، لیکن وہ

جانتے تھے کہ بنیادی نذر نشون کا کبھی علاج نہیں ہو سکتا، اور x کو پہلے ہی بسا دینا بعد کو

شراب میں خوشبو پیدا کرتا ہے اسی لیے انھوں نے تحفظ کو علاج پر ترجیح دی، جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ

ٹھکریا تو اپنے پاس رکھتے تھے یا اکیلا..... ان کا خود شراب سے اجتناب تمہارے لیے اس

کمین بہتر سبق تھا کہ وہ تم کو زبان سے روکتے..... تم نے کبھی انکو بدگوئی سے زبان آلودہ

کرتے نہ سنا ہوگا..... خصوصاً اتنا نرم مزاج شفیق، صابرا و جاکش باپ تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں

بڑے لڑکے کی موت کا شدید صدمہ | قدرت کی بے رحمی دیکھو کہ اُسے ایسی جفا کا نشانہ پرورش کے سب سے

پہلے ہی نمر کو بوڑھے باغبان کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یعنی فروری سہ ماہ میں برکے کا سب سے بڑا سب

پیارا ہونمارا اور نو عمر جگر پارہ ولیم نذر اجل ہو گیا۔ ان باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ برکے کو اس کا جتنا شدید

قلق ہوا ہوگا اس کا خیف سا اندازہ ذیل کے خطوط سے کرو۔

”میں ایک ایسا آدمی تھا جو سیاسی دھچپیوں، لوگوں سے ملنے جلنے اور ان تمام چیزوں سے جنگو

دنیا لطف و مسرت کتنی ہے یکسر دست کش تھا، میرا سرمایہ ایک تنہا سادہ دست تھا، جسکی

تعلیم ہمیشہ میری نگاہ کے سامنے ہوئی جسکی مصوری مجکو نشاط بخشی تھی جسکی موسیقی میں میر

یے دلکشی تھی، جسکی زندہ ولی اور غنہ فراہمی میری ہر وقت کی عید تھی، خدا کی مرضی نے

ہمکو مجھ سے لے لیا۔ اسکی خوبون اور مصورت شکل، اسکی معصومی اور نینداری خصوصاً اسکی

مجھے غیر معمولی محبت نے مجھ کو بہت ہی زیادہ اُس کا گردیدہ بنا رکھا تھا، میں صرف اس کا
ماشق نہ تھا بلکہ اسپر مقرر تھا میں نے اپنا دل سید لگا رکھا تھا۔ شاید اس سے بہت زیادہ
جتنا اس دنیا کی کسی چیز میں لگانا چاہیے!

بچپن کے دوست ٹام کا انتقال | اسی سال اس کے بچپن کے رفیق اور عزیز ترین دوست پیاسے
ٹام (ٹامس پراٹر) کا بھی انتقال ہوا۔ نفرس و تونج وغیرہ کی بیماریاں، انخطاط کا سن اور پھر اسپر
ان خدمات نے برکے کو بالکل ہی کہنا چاہیے کہ گرا دیا تھا۔ دینی اور وطنی خدمات کی تاب توانائی
نے جواب دیا، اور اب قرب موت کی حقیقی گوشہ نشینی کی آرزو تمام چیزوں پر غالب تھی وصیت
تک لکھ رکھی۔ بشپ کے عہدہ سے استعفا بھیج دیا۔ لیکن منظور نہیں ہوا۔ اور بادشاہ (جارج دوم)
کو جب معلوم ہوا کہ کس کا استعفا ہے! تو تصریح کے ساتھ حکم صادر کیا کہ برکے آخر دم تک بشپ
برکے ہی رہے گا۔ البتہ اسپر سے تمام منصبی ذمہ داریاں اٹھالی گئیں۔ اور پورا اختیار دیا گیا
کہ جہاں اسکی خوشی ہو رہے۔

اکسفرڈ | گو برکے اب اور تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ لیکن پدری فرایض سے
چشم پوشی اب بھی وہ نہیں گوارہ کر سکتا تھا۔ اور اپنے دوسرے بچے جارج کی تعلیم کے خاطر
بقیہ ایام زندگی اکسفرڈ یونیورسٹی کے زاویہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا کہ اولاد کی تعلیم کم از کم
اپنی نگاہ کے سامنے تو ہو۔ لیکن دراصل یہ ارض الموت کی کشش تھی۔ غرض اگست ۱۹۱۴ء
میں برکے اپنی بی بی، بچی (جولیا) اور جارج کو ساتھ لیکر اکسفرڈ روانہ ہو گیا۔

یہاں لوگوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا ہو گا۔ یونیورسٹی کے حلقہ میں اُس کا غیر معمولی
احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے بعض مصنفات کا ایک مجموعہ اور الیمنٹس کالکولس کا تیسرا ایڈیشن
اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ یہ علمی دنیا سے اس کا آخری خطاب تھا۔ اکسفرڈ کے عزت کدہ

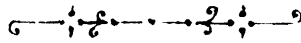
میں ابھی ۶ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ داعی اجل نے ۱۴ جنوری ۱۹۵۳ء کو دروازہ کھٹکھٹایا موت | ”تو ارکا دن تھا، شام کا وقت۔ برکلے ایک کوچ پر لیٹا ہوا تھا، بال بچے پاس بیٹھے تھے۔ بی بی تدفین کے وقت کی دعا، زور زور پر پڑھ کر سکوٹا ہی تھی، برکلے جا بجا کچھ تنقید و تشریح کرتا جاتا تھا۔ اتنے میں جو لیا چائے لیکر گئی تو دیکھا باپ سو گیا ہے۔ لیکن یہ آخری نیند تھی۔ برکلے کے وصایا کا ایک عجیب جز یہ تھا کہ میری لاش پانچ یا اس سے بھی کچھ زیادہ دن تک یونہی بے غسل و کفن انہی کپڑوں اور اسی بستر موت پر بے چھڑے پڑی رہنے دیجائے، چنانچہ اسکے مطابق وہ موت کے چھٹے دن کرائسٹ چرچ کے احاطہ میں مدفون ہوا،

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اوستیم تو نے وہ گنجائے گرا نما یہ کیا کیے زمین نے بے شک برکلے کے جسم خاکی کو اپنا پیوند بنالیا، لیکن اُسکے کارناموں سے ہزاروں دل و دماغ قیامت تک زندگی حاصل کرتے رہیں گے، اس مرنے والے کے زندگی بخش حالات کو اب ہم اسکی بیوہ کے ایک خط (ترتیبیت اولاد کے ذکر میں اسی خط کا ایک ٹکڑا) درج کیا جا چکا ہے، کی چند سطروں کے اور اقتباس پر ختم کرتے ہیں جس سے اسکی سیرت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

”وہ اپنی گفتگو، صحبت اور مختلف مشاغل سے گھر کو خوش بنائے رکھتا تھا۔ اسکی سبق آموز گفتگو پر ایک گہرا اور پائدار اثر پڑتا تھا..... وہ کسی دوست کی غلطی یا راز کو بھی فاش نہیں کرتا تھا۔ اکثر آدمی حسد سے دوسروں کی تحقیر لاطائل، بلکہ اس اور بدگوئی کے حریص ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ کسی کو اپنے سے بڑا یا شاید اپنے برابر بھی نہیں پاتا تھا، اسلئے وہ کسی پر حسد کیونکر کر سکتا تھا؟ انسان اشیاء اور کتابوں کے متعلق اسکا علم اتنا وسیع اور عالمگیر تھا کہ موضوع گفتگو کے لیے اُسکو کبھی بغلیں نہیں جھانکنا پڑتی تھیں۔ لیکن بالفرض اگر وہ

اتنا ہی بلید ہوتا تھا کہ متوقد الذہن تھا تو اس کا ضمیر اور نیک باطنی اس کے مہون کو بند رکھتی
 بجائے اسکے کہ اُنکو کسی بھائی کی توہین اور بدگوائی کے لیے کھوسے، وہ دل اور زبان دونوں کا
 صاف تھا۔ یہ خوبیاں کچھ وہ مان کے پیٹ سے دوسروں سے زیادہ لیکر نہیں آیا تھا
 بلکہ خود جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا اس کے اکتساب کا زیادہ حصہ تھا۔ وہ بارہ بجے اٹھ کر چراغ
 جلاتا تھا، اور مطالعہ و عبادت میں مصروف ہو جاتا تھا، تو اضع، از می، صبر، فیاضی، اور لوگوں
 کی روحانی و جسمانی بہبود کا خیال ہی اسکی تمام کوششوں کا مقصود واحد اور اسکی زندگی
 کی مصروفیت تھی۔“

تلك آثارنا تدل علينا
 فانظر وابعدا لے الاثار



تصنیفات

یون تو گھنٹے کے لیے ہر کھلے کے درختات، مکاتیب کو چھوڑ کر تین سے اوپر ہیں جن میں سوائے سو صفحات سے لیکر دو صفحہ تک کی تحریر شامل ہے لیکن ان سب کو ملا کر بھی صفحات کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور جن چیزوں کو مستقل تصنیف یا کتاب کی حیثیت حاصل ہے، وہ دن سے زیادہ نہیں۔ اس بنا پر ہر کھلے کو بائیں، مل واپس کی طرح ضخیم و کثیر التصانیف مصنفین کے زمرہ میں نہیں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اُس نے خود بھی جانسن کو ایک خط میں لکھا ہے کہ ”میں بڑی بڑی جلدیں لکھ کر دنیا کو زحمت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بلکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن اربابِ فکر و تامل کے لیے اشارات ہیں، جو چیزوں کی زمین گھسنے کے لیے اپنے اندر تجربہ اور مہلت رکھتے ہیں۔“ مضامین بحث میں تنوع و تعدد کے لحاظ سے بھی اسکو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے۔ البتہ مواضع تصنیف میں تبعاً بہت کافی ہے یعنی اگر ایک طرف خالص الہیات کے مباحث ہیں، تو دوسری جانب ماہِ القیصر کی طبی تحقیقات اور اقتصادیاتِ علمی و ملکی کے مسائل ہیں۔ آغاز تصنیف کی تین کتابوں یعنی نظریہ رویت، مبادی، اور مکالماتِ ہائلس و فلونس کے علاوہ باقی اکثر تحریریں، خصوصاً مکالماتِ السیفارن، سرس، اور مستفسر وسیع النظری کی حیثیت سے نہایت حیرت انگیز ہیں۔ قدیم و جدید فلاسفہ، حکماء اور متکلمین میں شاید ہی کوئی اس کے دائرہ واقفیت سے باہر ہو۔ ممالکِ یورپ کی زراعت، تجارت، صنعت و حرفت پر اقتصادی نقطہ نظر سے، اس کو

اس قدر عبور ہو کہ اُس زمانہ میں اس سے زیادہ کا امکان نہ تھا۔

لیکن برکھلے کی تصنیفی عظمت کا حقیقی راز ان چیزوں سے ماورا ہو جس نے برکھلے کو برکھلے بنایا، وہ وہ قوت انکشاف و اجتہاد فکر ہے جسکی جھلک اُسکے علمی کارناموں کے ایک ایک صفحہ پر موجود ہے، اور جسکی بدولت وہ آج تاریخ فلسفہ کا نقطہ انقلاب سمجھا جاتا ہو۔ اسکا نظریہ جدید علم النفس کا عصر جدید ہے۔ اسکی مبادی الہیات میں مذہب تصورات کی بوس و تتم ہے۔ اخلاقیات میں وہ افادیت کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ریاضی کے مسلمات تک، جنکو ہر حکیم و فلسفی سب سے چون و چرا قبول کر لیتا ہے۔ اور جنہیں شک شریعت سائنس کی رو سے کفر ہے، اس کے مجتہدانہ حملوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

سوانح کے ساتھ ہم نے برکھلے کے تقریباً تمام نوشتات کا کچھ نہ کچھ ذکر کر دیا ہے، اس کے علاوہ چونکہ ہمارا اصل موضوع فلسفہ برکھلے ہے، اسلئے کیسے تفصیل کے ساتھ ہم ذیل میں محض اُن کتابوں سے بحث کریں گے جو براہ راست یا ضمناً فلسفیانہ مصنفات خیال کیے جاتے ہیں۔ باقی ڈیٹا، مکالمات السیفارن اور سرس، صرف ضمنی حیثیت اس بحث کی تحت میں آسکتی ہیں۔

۱۔ جدید نظریہ رویت

یہ کتاب دراصل برکھلے کے فلسفہ کی تصویر کا ایک رخ ہے، جو سال بھر کے بعد مبادی کے صفحات پر اپنے تمام خد و خال کیسٹا نمودار ہوئی، اور جبکا حاصل یہ تھا کہ کسی شی کا احساس و ادراک ہی اس کا حقیقی وجود ہے، باقی کسی محسوس چیز کا، نفس مُدرک اور احساس کرنے والے ذہن

۱۔ دیکھو عنوان خلفہ تصویریت ۱۵ دیکھو ذکر "السیفارن"

سے الگ اور باہر وجود ماننا ایک صریحی تناقض ہے، لہذا سب سے مقدم کام یہ تھا کہ نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ اس بات کو طے کر دیا جائے کہ محسوسات کے خارج از ذہن موجود ہونے کا اعتقاد کیونکر پیدا ہوتا ہے اور خود خارج کی کیا ماہیت ہے۔

تکوینیت ذرا سا غور کرنے سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس اعتقاد کا دار و مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ ہم کو اپنے محسوسات عیناً ذہن سے الگ اور خارج میں دکھائی دیتے ہیں ہم آنکھ کھولتے ہیں، تو مکان، درخت، حیوانات وغیرہ اپنی ذات سے مختلف فاصلوں پر نظر آتے ہیں۔ ان چیزوں کے مختلف قد و قامت (امتدادات) اور وضع، یعنی جیت، پست، سیدھا، اور الٹا ہونا، یا کسی کا نیچے ہونا، کسی کا اوپر کسی کا داہنے کسی کا بائیں یہ تمام باتیں کھلم کھلا آنکھ سے نظر آتی ہیں۔ اس لیے گویا اشیا کا وجود خارجی ایک مرنی حقیقت ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس اعتراض کی اہمیت سے برکے اچھی طرح خبردار تھا۔ ایسیلے اپنا اہلی فلسفہ پیش کرنے سے پہلے اس عالمگیر غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے اُس نے نظریہ رویت پر قلم اٹھایا، جس کا موضوع بحث خود اُسی کے الفاظ میں یہ ہے ”میرا مقصد یہ بتلانا ہے کہ چیزوں کے فاصلہ (بعد) امتداد اور باہمی وضع کا احساس ہم کو حاسہ بصر کے ذریعہ سے کیونکر حاصل ہوتا ہے نیز اس فرق پر غور کرنا، جو تصورات بصر اور تصورات لمس کے مابین ہے، ساتھی یہ معلوم کرنا کہ کیا کوئی ایسا تصور ہے جو مشترکہ طور پر لمس و بصر دونوں سے محسوس ہوتا ہو“ (بند اطل) (نظریہ رویت)

اس کتاب کے مہمات مباحث کی تحلیل چار اجزا میں کی جاسکتی ہے جنکو ہم ذیل میں یکجا درج کر کے علی الترتیب بحث کرتے ہیں۔

۱۔ امتداد (طول، عرض، عمق) شکل (مثلث، مربع، مدور، وغیرہ ہونا، حرکت (انتقال

مکانی) خارجیت (فاصلہ، مکان، یا بعد) وضع، مزاحمت، وصلابت کے تصورات حاسہ لمس سے حاصل ہوتے ہیں۔

۲۔ حاسہ بصر سے براہ راست وبالاصل صرف رنگ و روشنی اور ان کے مراتب

مختلفہ کے تصورات کا علم ہوتا ہے۔ امتداد، شکل اور حرکت کے تصورات بھی مرئی کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں اور لمس کے تصورات امتداد، شکل و حرکت میں باہم کسی طرح کی مماثلت نہیں ہوتی، اور ان کا وجود بھی رنگ کی طرح حاسہ بصر سے باہر نہیں ہوتا۔

۳۔ خارجیت یعنی فاصلہ، بُعد یا مکان کا تصور مطلقاً حاسہ بصر سے نہیں حاصل ہوتا نہ کوئی

ایک ہی تصویر ایک سے زائد حاسوں سے مشترک محسوس ہو سکتا ہے۔

۴۔ حس بصر ایک طرح کی زبان ہے، جس کے الفاظ (تصورات بصری) اپنے معانی

(تصورات لمسی) پر دلالت کرتے رہتے ہیں۔ استلافات ذہنی کی بنا پر تصورات بصری سے تصورات لمسی کی جانب اسی طرح بلاشور ذہن کا انتقال ہو جاتا ہے، جس طرح کسی لفظ سے اس کے معنی کی جانب۔ اور ان دونوں میں کوئی لزومی علاقہ نہیں ہوتا۔

پہلا مقدمہ تو نامی اور فلسفی سب کے مسلمات میں شامل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک

مادر زاد اندھا چھو کر چیزوں کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گولائی وغیرہ کا پتہ لگا لیتا ہے۔ اس کے جسم پر کوئی کیڑا بیگنا ہے، تو انکی حرکت صاف محسوس ہوتی ہے، کسی چیز کو چھونے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دیکر اس تک پہنچا پڑتا ہے اس حرکت میں ایک زمانہ صرف ہوتا ہے، جس سے

اس کو چیزوں کے مختلف فاصلوں اور دوری و نزدیکی کا تصور حاصل ہوتا ہے، مکان یا بعد کا تصور بھی اسی حرکت جسم سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ اندھا، اپنے سر، قدم، یمین و یسار

کی نسبت سے اوضاع کا علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً اس کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس کو وہ نیچے سے اوپر تک ٹٹولتا ہے، جس سے مختلف لمبی احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا نام سر ہے اور بعض کا پیر جس حصہ جسم کو زمین سے قریب تر پاتا ہے اس کو نیچے کہتا ہے، اور جس کو اس سے بعید تر محسوس کرتا ہے، اس کو اوپر کہتا ہے، پھر جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے تمام اعضاء جسم میں یکساں بعید تر ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ آدمی سیدھا کھڑا ہے۔ لیکن اگر دفعۃً اسکی آنکھیں کھل جائیں تو جب تک بصری اور لمبی احساسات کے ساتھ ساتھ تجربات سے استقامت ذہنی نہ پیدا ہو لیں، اسکو پتہ نہ چلے گا کہ فلان آدمی سیدھا کھڑا ہے، یا الٹا۔ باقی صلابت و محبت تو کتنا چاہیے کہ اس کے احساسات مخصوصہ میں ہیں۔ کیونکہ جب کوئی شے ہمارے جسم کو حرکت سے روکتی اور نفوذ سے باز رکھتی ہے، تب ہی ہم کو مزاحمت کا حس ہوتا ہے اور اسی نفوذ کے مختلف مدایج احساسات کا نام صلابت یا رقت ہے۔

دوسرے مقدمہ کے اتنے جزین تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ رنگ اور روشنی بصر کے سو کسی اور حاسہ سے نہیں محسوس ہوتے ساقی یہ بھی سلم ہو چکا ہے کہ رنگ و روشنی کا احساس محض ذہنی ہے۔ البتہ یہ امر بحث طلب ہے کہ بصر سے صرف رنگ و روشنی ہی کا احساس ہوتا ہے۔ باقی امتداد شکل براہ راست آنکھ سے نہیں محسوس ہوتے، یا جو امتداد شکل مرئی یعنی محسوس بصر ہے وہ اس امتداد شکل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جو چھونے سے حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ کلیۃً ایک ذہنی شے ہے جسکا حاسہ سے باہر وجود نہیں۔ کیونکہ علی العموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو امتداد شکل چھونے سے محسوس ہوتا ہے، وہی بعینہ بصری حاسہ

دکھائی بھی دیتا ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں، اور دونوں حقائق خارجی ہیں لیکن برکت صرف لمبی امتداد و شکل کو خارجی حقیقت مانتا ہے، باقی بصری امتداد و شکل کو اول الذکر سے بالکل مختلف اور محض ذہنی قرار دیتا ہے۔

ایک ہی شے مختلف فاصلوں اور حالات کے اندر مختلف اشکال و امتدادات کی نظر آتی ہے۔ مثلاً ہم کو نہایت دور کوئی دھندلی دھندلی شے دکھائی دیتی ہو، جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ آدمی ہے، درخت ہے، جانور ہے، یا کوئی اور شے، جیسا جیسا ہم اس کے قریب ہوتے جاتے ہیں، اس کے امتداد و شکل کے تصورات میں بھی تغاؤ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ہم اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جانور ہے۔ اب کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جو قد و قامت یا شکل و شبہت اس جانور میں نظر آتی ہے، وہ وہی ہے، جو پہلے ایک میل کی دوری پر یا اسکے بعد کے مختلف فاصلوں سے دکھائی دیتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر ہماری آنکھوں کی ساخت کچھ مختلف ہوتی، تو اس وقت پاس کھڑے ہوئے، اس جانور کی جو شکل اور قد آنکھ سے محسوس کر رہے ہیں، اس سے بھی یہ بڑا یا چھوٹا نظر آتا، جیسا کہ بعض دوسرے حیوانات کو ایک ہی فاصلہ سے ایک ہی چیز کا قد اس سے مختلف معلوم ہوتا ہو، جیسا انسان کو نظر آتا ہے۔ بلکہ اگر ہم خود چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو خوردبین وغیرہ آلات کی مدد سے دیکھتے ہیں تو، ان کا امتداد اور ان کی شکل میں اس امتداد و شکل سے زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے جو معمولی آنکھوں سے محسوس ہوئی تھی۔ اسی قسم کی میسین اور شالین پیش کی جاسکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالات کے اختلافات سے ایک ہی چیز مختلف امتدادات اور شکلوں کی دکھائی دیتی ہے۔ اب تم ہی ذرا سوچ کر بتاؤ کہ ان سیکڑوں متفاوت اشکال و امتدادات

میں سے کس بنا پر ایک کو حقیقی یا لمسی امتداد شکل کا مرئی یا مثالی کہا جاسکتا ہے یا یہ کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ فلاں شکل و امتداد جس کو ہم دیکھ رہے ہیں، بعینہ وہی ہی جو چھوٹے سے محسوس ہوا تھا، پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تمام مناقض امتدادات و اشکال جو مختلف فاصلوں سے نظر آتے ہیں، سب کی سب کسی ایک شی کے واقعی یا لمسی اشکال و امتدادات ہیں، لہذا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان بصری امتدادوں اور شکلوں کا وجود حاسہ بصر یا ذہن سے باہر نہیں ہے، اسکے علاوہ اتنا تو تقریباً تمام حکما و فلاسفہ قبول کرتے ہیں کہ رنگ کا وجود ذہن سے باہر نہیں، تو پھر امتداد و شکل جو رنگ ہی کی خاص خاص مقادیر ہیں اور جب کارنگ سے مجرد و مفصل وہم میں بھی تخیل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ذہن سے باہر موجود ہو سکتے ہیں۔

اصل دھوکا یہ ہے، کہ بلا کسی آلہ کی اعانت کے ایک خاص قربت سے انسان کو علی العموم کسی شے میں جو شکل و امتداد نظر آتا ہے، اس کو وہ غلط فہمی سے واقعی اور خارجی قرار دے لیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنا عملی زندگی کے کاروبار کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ناگزیر تھا، اس لیے ہزاروں سال کے تعصبات و استعمالات کے بعد اب فلسفیانہ حیثیت سے بھی اس غلط فہمی کو دور کرنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں اکثر علمائے نفسیات و فلاسفہ نے برکھ کے اس انکشاف عظیم کو قبول کر لیا ہے، وہاں بہتیرے ایسے بھی ہیں جو آج تک مخالف ہیں۔ اس مخالف جماعت کی جانب سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں بہت زیادہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ کوئی نہ کوئی امتداد و شکل تو ہم کو آخر محض آنکھ سے نظر ہی آتا ہے، خواہ وہ غیر حقیقی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ دراصل ایسے لوگوں کا اعتراض ہے جنہوں نے خود نظریہ رویت کو کبھی غور سے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بلکہ ادھر ادھر سے ایک بات سے اڑے۔ ورنہ اتنا تو خود برکھ نے تسلیم کیا ہی جیسا کہ تم کو ابھی معلوم

ہو چکا ہے کہ ایک طرح کے بصری استدلال کا بھی وجود ہے، لیکن وہ حاسہ بصر یا ذہن سے باہر نہیں ہے اور نہ اُس خارجی حقیقی استدلال کے مماثل ہے، جو چھو کر محسوس ہوتا ہے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نظریہ رویت، مین برکھے محسوسات لمس کو خارجی اور واقعی مانتا ہے۔ اسی لیے یہ اُس کے فلسفہ کا صرف ایک رُخ یا ایک کڑی ہے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ چیزوں کے موجود فی الخارج ہونے کا اذعان زیادہ تر اس پر مبنی ہے کہ وہ علانیہ ہم کو مختلف فاصلوں پر نظر آتی ہیں، اور یہ فاصلے بالذات مرنی یقین کیے جاتے ہیں۔ لہذا تیسرے دعویٰ کو برکھے کے اصل فلسفہ سے قدرتا زیادہ قریبی تعلق ہے اور اسی لیے اُس نے علی الاطلاق یہ ثابت کرنا چاہا، کہ فاصلہ کسی حیثیت سے بھی محسوس بصر نہیں بلکہ قطعاً غیر مرنی ہے، البتہ گزشتہ تجربات اور استلافات ذہنی کی بنا پر مختلف علام بصری کے ذریعہ سے مختلف فاصلوں کی طرف نہایت تیزی سے بلاشور ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس سے ہم کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ خود فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔

برکھے نے جس طریقہ سے اس دعویٰ کا اثبات کیا ہے اس کو دراصل تجلی یا تشریحی استدلال کہنا چاہیے۔ یعنی افعال ذہن کی تحلیل سے یہ دکھایا گیا ہے کہ جس چیز کو تم براہ راست محسوس بصر خیال کرتے ہو وہ حقیقت میں مکسوب بصر ہے، اور ایسے استلافات ذہنی موجود ہیں جن سے اسکے مکسوب ہونے کی پوری طرح توجیہ ہو جاتی ہے۔ لہذا اس کو ایک مستقل حاسہ کی جانب مسوب کرنا غیر ضروری اور بے ثبوت بات ہے۔ مل نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جن علامات بصری کی وساطت سے ہم فاصلہ اور بعد کا تصفیہ کرتے ہیں ان کا تعلق ہمارے اور اکات فاصلہ کے ساتھ بعینہ اسی قسم کی شہادت پر مبنی ہے جس سے دوسری چیزوں میں علت و معلول کا علاقہ ثابت کیا جاتا ہے، یعنی جب علت موجود ہوتی ہے تو

معلول کا بھی ظہور ہوتا ہے، جب علت نہیں پائی جاتی تو معلول بھی نہیں وقوع پذیر ہوتا، اور جب علت میں کوئی تغیر واقع ہوتا ہے تو معلول بھی متغیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مثلاً جب ہم کسی چیز کو دور بین سے دیکھتے ہیں تو اس آلہ کا بصری اثر صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز قضاے رویت کے اُس زیادہ حصہ کو گھیر لیتی ہے جتنی بے اس آلہ کے گھری ہوئی نظر آتی تھی، اور اس وجہ سے ہم یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اب ہکو یہ چیز پہلے سے بڑی دکھائی دیتی ہے اور چونکہ بڑی دکھائی دیتی ہے اسی لیے پہلے سے قریب تر بھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر ایک آدھ مثال اور دیکھو کہتا ہے کہ جب کوئی سیار (علامت) ... نہیں موجود ہوتا تو ہکو مطلقاً فاصلہ نہیں دکھائی دیتا۔ مثلاً مساوی اجسام کہ جنکے فاصلوں کے اختلاف کا ہکو کوئی احساس نہیں ہوتا اسی لیے وہ سب کی سب مساوی فاصلہ پر معلوم ہوتے ہیں۔

اس سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ زیادہ دور کی چیزوں کے فاصلہ کا جو اندازہ کیا جاتا ہے وہ جس سے زیادہ اُن علامت سے ماخوذ ہوتا ہے، جنکے اختلاف کا فاصلہ کے قرب و بعد کے اختلاف کے ساتھ ہکو متواتر اور روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے، ان علامت میں سے ایک کی مثال ل کے اقتباس میں گزرجکی، یعنی مرئی چیز کا کبر و صغر، جس سے علی الترتیب اُس کے قرب و بعد کا ہکو اسی طرح علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کے چہرہ کی زردی اور سُرخی سے خوف و شرم کا۔ حالانکہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہم خوف یا شرم کو بالذات دیکھتے ہیں۔ بعض اور علامت کی مثال سے اس نظریہ کی مزید تحلیلی توضیح کے لیے ہم خود برکھ کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

”میں ایک چیز کو دکھتا ہوں، جو ایک مخصوص مرئی رنگ و شکل کی نظر آتی ہے، جسکے

ساتھ ایک خاص حد تک دھندھلا پن اور بے حس اور ایسے حالات بھی شامل ہیں، جن سے
 میں اپنے گزشتہ مشاہدات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتا ہوں کہ اگر میں اتنے قدم یا اتنے میل آگے
 بڑھوں تو فلاں فلاں تصورات بس سے متاثر ہوں گا، لہذا درحقیقت اور صحیح معنی میں نہ
 تو میں خود فاصلہ کو دیکھتا ہوں، اور نہ وہ چیز جس کو ایک خاص فاصلہ پر موجود سمجھتا ہوں.....
 یہ تو خود میرا حال ہے۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ جو شخص بھی خود اپنے خیالات کی توجہ
 سے پر تال کرے گا، اور اس بات کو سوچے گا کہ جب وہ یہ کہتا ہے کہ فلاں چیز جس کو ایک فاصلہ
 پر دکھائی دیتی ہے، تو اسکی مراد کیا ہوتی ہے، تو وہ مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جس شے کو وہ
 دیکھتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتی ہے کہ ایک خاص فاصلہ طے
 کرنے کے بعد (جو اس وجہ سے کہ اپنے جسم کی حرکت سے ناپتا ہے محسوس ہوتا ہے) وہ ان
 فلاں فلاں بسی تصورات سے دوچار ہوگا، جو فلاں فلاں مرئی تصورات کے ساتھ بالعموم
 وابستہ رہتے ہیں۔“

اس قباس میں جس علامت کی تشریح ہے وہ چیزوں کا دھندھلا پن یا صفائی
 کے ساتھ نظر آنا ہے۔ جنکے مختلف مراتب سے ہم فاصلہ کے تفاوت کا اسی طرح قیاسی
 علم حاصل کرتے ہیں جس طرح صغرو کبر سے۔ یعنی جب قدر کوئی چیز دھندھلی دکھائی دیتی ہے
 اسی قدر ہم اس کو دور سمجھتے ہیں اور جب قدر صاف ہو اسی قدر قریب خیال کرتے ہیں۔
 اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تخلیلی استدلال سے اُسی وقت پوری تشفی حاصل ہوتی ہے
 جب آدمی خود سوچے، ایسے جیسا کہ برکھ نے کہا ہے، تم کو خود غور کرنا چاہیے کہ کس طرح
 علامت بصری سے بالواسطہ فاصلہ کا علم ہو جاتا ہے۔

اوپر کی نشانوں اور تشریحات سے اتنا تو اچھی طرح واضح ہو گیا کہ زیادہ دور کی چیزوں کے فاصلہ کا اندازہ کسی چیز کی چھوٹائی، بڑائی، دھندھے پن اور صفائی وغیرہ سے کیا جاتا ہے اور وہ بالذات رنگ و روشنی کی طرح آنکھ سے نہیں دکھائی دیتا۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ قریبی فاصلے بھی اسی قانون کے ماتحت نہوں، لیکن چونکہ وہ علامت یا نشانات جن سے قریب کی چیزوں کی نزدیکی اور دوری کا ذہن پہ لگاتا ہے، زیادہ بعید الفاصلہ چیزوں کے علامت سے مختلف اور کسی قدر دقیق ہیں، اسلئے آدمی کو نزدیک کے فاصلوں میں اس امر کا زیادہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ براہ راست رنگ و روشنی کی طرح آنکھ ہی سے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک شے جو چند قدم یا چند گز کے فاصلہ پر ہے، وہ اگر ایک آدھ قدم یا ایک آدھ گز آگے پیچھے ہٹ جاتی ہے تو بڑائی، چھوٹائی یا صفائی اور دھندھے پن کے لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا، لیکن فاصلہ کی کمی زیادتی کا فوراً اور اک ہو جاتا ہے، جس سے قدرتا ہمو خیال ہوتا ہے کہ خود فاصلہ دکھائی دے رہا ہو۔ لہذا برکے نے نہایت دقت نظر سے اُن علامات کا استقصا کیا ہے، جن سے نزدیک کی چیزوں کے فاصلہ کا ہم استنباط کرتے ہیں، یہ علامات کل تین ہیں۔

۱۔ جب دونوں آنکھوں سے ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں، تو جس قدر یہ ہم سے قریب یا دور ہوتی جاتی ہے، اُسی نسبت سے دونوں پتلیوں کے بیچ کا فاصلہ کم یا زیادہ ہو جاتا ہو پتلیوں کی اس حرکت سے ایک خاص عضلی حس پیدا ہوتا ہے جس سے فاصلہ کے تفاوت کا علم حاصل ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ جب کسی چیز کو آنکھ بہت نزدیک کر لو تو وہ نخل نظر آنے لگتی ہے، اور جبنا ہی اسکو

قریب تر کرتے جاؤ گے اتنا ہی یہ اختلاف بڑھتا جائے گا جس سے فاصلہ اور اختلاف کے مختلف درجات میں عادتاً ایک علاقہ پیدا ہو جاتا ہے، لہذا جس نسبت سے اختلاف زیادہ ہوتا ہے اسی نسبت سے فاصلہ کم محسوس ہوتا ہے اور جس قدر اختلاف کم ہوتا ہے یعنی چیز صاف نظر آتی ہے اسی قدر فاصلہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں پر ایک حد تک زور دیکر اس اختلاف کو کچھ دیر کے لیے روک سکے ہیں اس حالت میں آنکھوں پر زور دینے سے جو حس پیدا ہوتا ہے وہ اختلاف نظر کے حس کا قائم مقام ہو جاتا ہے، اور اس کے مختلف درجات سے فاصلہ کے تفاوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جتنا ہی زیادہ زور پڑتا ہے اتنا ہی کم فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔
دکڑا لک بالعکس۔

ان سہ گانہ علام بصری سے فاصلوں کے اختلاف و تفاوت کی جانب حسب طرح بالوہطہ ذہن کا انتقال ہوتا رہتا ہے اس کا ہر آدمی بجائے خود تجربہ کر سکتا ہے۔ اور ذرا اسی توجہ کے بعد یہ روشن ہو سکتا ہے کہ آنکھ سے انسان کو فاصلہ کا بالکل اسی طرح علم ہوتا ہے جس طرح مکان سے۔ "میں اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوں سڑک سے ایک گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنتا ہوں"..... آواز کے تفاوت سے گاڑی کے مختلف فاصلوں کا بے دیکھے احساس ہوتا رہتا ہے..... اس طرح گویا میں فاصلہ کا کان سے بعینہ اسی طرح احساس کرتا ہوں جس طرح آنکھ سے، لیکن با این ہمہ یہ نہیں کہتا کہ میں فاصلہ سن رہا ہوں، جیسا کہ یہ کہتا ہوں کہ فاصلہ دیکھتا ہوں۔ انکی وجہ یہ ہے کہ محسوسات لمس و بصر میں بہ نسبت محسوسات لمس و سمع کے، قیاس کا زیادہ موقع ہے۔ لہذا ایک آدمی کو زیادہ سہولت سے یقین آ جاتا ہے کہ اجسام یا خارجی اشیاء صحیح معنی میں سننے کی

چیزیں نہیں ہیں، بلکہ سماعت کی شے صرف آواز ہے جسکے توسط سے کسی خاص جسم یا اصل کے تصور کی جانب ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ بہ خلاف اس کے بصر و لمس کے تصورات ہیں جو فرق ہے اس کا تیز کرنا زیادہ دشوار ہے، اگرچہ یہ قطعی ہے کہ بعینہ ایک ہی شے کو دیکھنا اور چھونا اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے، جتنا ایک ہی شے کو سننا اور چھونا، اسیلے یہ کہنا کہ فاصلہ محسوس و بصر و ذہن ہے، ایک مہمل بات ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ قوة لامسه کے محسوسات، یعنی امتداد، بعد، فاصلہ وغیرہ کا باصرہ سے براہ راست احساس نہیں ہوتا، بلکہ خاص خاص مرئی علامات کے توسط سے لمسی احساسات کی جانب بے شعور ذہن کا انتقال ہو جاتا ہے جسکی وجہ ان دونوں کا وہ مابینی علاقہ ہے جس کا ہکومت و اثر تجربہ ہوتا رہتا ہے، اور ہوا لازماً ان دونوں کے مابین ذہنی استلافات پیدا کر دیتا ہے۔ ساقھی یہ بھی معلوم ہے کہ ان علامت بصر اور محسوسات لمس میں کوئی لزومی ارتباط نہیں ہے۔ مثلاً موجودہ تجربہ کی رو سے جب کوئی چیز قریب تر ہوتی ہے تو بڑی نظر آتی ہے۔ اور بعید تر ہوتی ہے تو چھوٹی۔ جس سے بڑائی نزدیکی کی علامت بن جاتی ہے اور چھوٹی دوری کی۔ لیکن فرض کرو کہ آنکھوں کی ساخت ایسی واقع ہوتی کہ اسکے بالعکس تجربہ ہوتا، یعنی جب کوئی چیز قریب ہوتی تو چھوٹی دکھائی دیتی، اور دور ہوتی تو بڑی، تو یہ علامات بھی اپنی دلالت کے لحاظ الٹ جاتیں، یعنی جب کوئی چیز چھوٹی نظر آتی تو ہم اس کو نزدیک سمجھتے اور جب بڑی نظر آتی تو دور۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس بڑائی یا چھوٹائی کو قرب یا بعد کیساتھ کوئی لزومی علاقہ نہیں جسکی بنا استلاف ذہنی سے ماوراء کسی اور چیز پر ہو۔ لہذا علامت بصر کو محسوسات لمس سے وہی تعلق ہے، جو لفظوں کو معانی سے جس طرح کسی لفظ سے معانی کی طرف

محض توازن استعمال اور اختلاف ذہنی کی بنیاد پر ذہن دوڑ جاتا ہے، بعینہ اسی طرح ایک نئی علامت سے اسی محسوس کی جانب۔ تو گویا یہ علامت بصری ایک طرح کی زبان کا کام دیتے ہیں جسکو برکے لسان الہی قرار دیتا ہے۔ جو ہمارے مقدمات اربعہ کا آخری نمبر جو حاصل یہ ہے کہ جدید نظریہ رویت کے وجود میں آنے سے پہلے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خارجیت فاصلہ یا بعد اور شکل و امتداد وغیرہ کا حاسہ بصر سے اسی طرح بالذات و براہ راست احساس ہوتا ہے، جس طرح حاسہ لمس سے برکے نے یہ ثابت کیا کہ بعینہ کوئی ایک ہی شے مشترک طور پر براہ راست دو حاسوں سے نہیں محسوس ہو سکتی، البتہ ہر حاسہ میں اسکی قابلیت ہے کہ وہ اپنے خاص محسوسات کے توسط سے گذشتہ تجربات و اختلافات ذہنی کی بنا پر دوسرے حاسوں کے احساسات کا اکتسابی طور پر علم حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا فاصلہ و امتداد وغیرہ جو بالذات صرف قوت لامسہ سے محسوس ہونے میں آنکھ سے ان کا صرف اس طرح علم حاصل ہو جاتا ہے کہ رنگ و روشنی کے خاص خاص مرئی احساسات کے ساتھ جن مختلف لمسی احساسات کا تجربہ ہوتا رہا ہے انکی جانب مرئی احساسات سے اسی طرح ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس طرح الفاظ سے منی کی جانب لیکن اگر کوئی شخص زبان سے ناواقف ہو، تو وہ ان لفظوں سے کوئی مطلب نہیں نکال سکتا، چنانچہ اگر ایک مادر زاد اندھے کی آنکھوں میں دفعۃً بینائی آجائے تو اسکو رنگ و روشنی تو نظر آوے گی لیکن اس سے وہ اشیاء کے لمسی امتداد و فاصلہ پر استدلال کر سکے گا اور لازماً اسکو کوئی شے اپنے سے دور یا نزدیک نہ معلوم ہوگی بلکہ ہر چیز آنکھ کے اندر یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن میں محسوس ہوگی۔

اتفاق یہ کہ برکے کی زندگی میں مسئلہ میں چپلن نامی ایک شخص نے ایک رسالہ میں کسی ایسے آدمی کے متعلق اپنے مشاہدات شائع کیے جو چپن سے اندھا تھا۔ لیکن بعد میں

کے آنکھ میں روشنی آگئی، اس بیان کا اقتباس برکھلے نے نظریۂ لسان بصری کا اثبات و تشریح کے نام سے جو رسالہ لکھا ہے، اس کے آخری بند میں درج کیا ہے جسکے چند جملے یہ ہیں۔
 ”جب پہلی مرتبہ اس نے دیکھا تو وہ مختلف فاصلوں کا تصفیہ کرنے سے اتنا ہی ناچار تھا کہ (جیسا کہ اس نے ظاہر کیا) یہ خیال کرتا تھا کہ تمام چیزیں اسکی آنکھوں سے اسی طرح مس ہوتی ہیں جس طرح وہ چیزیں جنکو وہ چھوتا ہے کھال سے مس کرتی ہیں..... نہ اسکو کسی چیز کی شکل کا پتہ چلتا ہے نہ وہ دو چیزوں میں خواہ وہ شکل و امتداد کے لحاظ سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں فرق و امتیاز کر سکتا تھا، لیکن جب اسکو یہ بتلایا جاتا تھا کہ فلاں چیز وہی ہے جسکی شکل کو تم پہلے چھو کر جانتے تھے، تو وہ اس کو نہایت غور سے دیکھتا تھا تاکہ وہ دوبارہ اس کو پہچان سکے مگر چونکہ ایک ساتھ اس کو بہت سی چیزیں سیکھنا پڑتی تھیں اسلئے وہ بھٹوں کو بھول جاتا تھا“
 انجین اور بھی اسی صنف کے بہت سے تجربات کیے گئے ہیں۔

برکھلے کے اس انکشاف سے اُسکے اصل فلسفہ اور مبادی کے نظریۂ الہیات کی تائید ہو یا نہ ہو، لیکن علم النفس میں رویت کے اس نظریۂ جدید کی جواہریت و عظمت ہے اسکا درست و دشمن سبکو اعتراف ہے اور آج یہ انکشاف عظیم کہنا چاہیے کہ نفسیات کے اُن اور مہمات ابواب میں داخل ہے جسکو کوئی عالم نفسیات نظر انداز نہیں کر سکتا۔ گذشتہ دو صدیوں کے اندر اسکی تائید و تنقید پر جتنا لٹریچر پیدا ہو چکا ہے اس کو اگر یکجا کر دیا جائے تو ایک دفتر کا دفتر بن جائے گا۔

۲۔ مبادی علم انسانی

یہی کتاب برکھلے کا وہ کارنامہ ہے جسکی بنا پر یہ کہنا بالکل بے مبالغہ ہے کہ وہ فلسفہ جدید

سے اسکے وجود کا قیاسی علم حاصل ہوتا ہے۔ بس یہی ایک نظریہ میں مادہ ہر جگہ پر کچھ قطعاً منکر ہے۔
 مادہ کی اس تشریح بالا میں ایک سے زائد بحث طلب بیانات اور غیر ثابت محاورے
 شامل ہیں۔ احساسات کو اعراض کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اعراض کے قیام کے لیے
 کسی موجود فی الخارج جو جسمی کا وجود کیوں ضروری ہے؟ خود ادراک کرنے والا نفس اُنکے
 قیام کے لیے کیوں نہیں کافی؟ یہ بے حس اور غیر محسوس جو ہر ذی حس اذ بان یا نفوس
 میں کوئی تصور یا احساس کیونکر پیدا کرتا ہے؟ اور اُن پر کیوں کر عمل کرتا ہے؟ ان میں سے
 ہر چیز کا بار ثبوت مدعیانِ مادہ کی گردن پر ہے، اور کسی ایک سے بھی عہدہ براہونا آسان
 نہیں۔ لہذا ہر کچھ کے انکار کے لیے صرف اسی قدر کافی تھا کہ ایک ایسی شے کا وجود
 کیونکر مقبول کیا جائے جس کا نہ تو براہِ راست خود حواس سے علم ہوتا ہے، نہ کسی قیاسی
 حجت سے اسکی طرف ناگزیر احتیاج ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس نے صرف اس پر
 قناعت نہیں کی، بلکہ یہ دکھلایا کہ یہ دعویٰ مستلزم تناقض ہے۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے
 کہ ہمارے محسوسات یا تصورات جیسے مثلاً شکل و امتداد و حرکت وغیرہ محض ذہنی
 نہیں ہیں، بلکہ اس شکل، امتداد یا حرکت کے مماثل اور مناسبتہ ہیں۔
 جو ایک خارج از ذہن جو جسمی میں موجود ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا خود وہ حرکت شکل یا
 امتداد جو خارج میں جو جسمی کے ساتھ قائم ہے، محسوس ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ
 بھی ہمارا ایک ذہنی تصور ہے اور اگر نہیں، یعنی یہ خارجی شکل و امتداد وغیرہ خود محسوس نہیں
 اور ہمارے احساسات و تصورات سے کلیتہً بیگانہ ہیں تو پھر وہ کسی ایسے چیز کے مماثل
 کیسے ہو سکتے ہیں جو محسوس و تصور ہے، اس لیے کہ ایک تصور دوسرے تصور کے علاوہ کسی
 اور شے کے مانند نہیں ہو سکتا، فرض کرو تمہارے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ جاتا ہے جس سے

ایک قسم کا درد محسوس ہوتا ہے، اب درد کا احساس یا تصور اگر مشابہ ہو سکتا تو کسی دوسرے تصور درد ہی کے مشابہ ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایسے درد کے مانند ہو جس کا تم کو احساس نہیں ہو سکتا۔ برکے نے اسی استدلال پر بے انتہا زور دیا ہے اور سچ یہ ہے کہ جس قدر وجود مادہ کے اس عقدہ کو کھولنا چاہو اُسی قدر یہ اور لائیخل ہو جاتا ہے۔

بہ خلاف اس کے، خود برکے کا نظریہ اس طرح کے اشکالات سے بالکل پاک اور بدیہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے تصورات حسیہ سے ماورا اور خارج کسی غیر محسوس شے کے وجود کا مدعی ہی نہیں ہے، لہذا خود اپنے تصورات ذہنی کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے اور تصور و ادراک کرنے والی ذات کے وجود سے زیادہ جسکو ہم انا، ایغو، نفس، ذہن، وغیرہ کہتے ہیں، اور کون سی چیز بدیہی یا قطعی ہو سکتی ہے۔ البتہ چونکہ ان تصورات حسی کا پیدا اور فنا ہونا انسانی ارادہ کے ماتحت نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ مثلاً ہم آنکھ کھولیں۔ اور یہ چاہیں کہ کوئی چیز نہ دکھائی دے، یا فلان چیز پہلے اور فلان بعد کو نظر آوے تو یہ آدمی کے بس سے باہر ہے، ایسے لامحالہ ایک ذی ارادہ اور فاعل نفس یا روح کا قائل ہونا پڑتا ہے، جو ان تصورات حسی کو انسان کے ذہن یا نفس پر مرمم کرتا رہتا ہے، اسی کو برکے روح برتر یا خدا کہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک بے حس بے ذہن بے ارادہ نامعلوم جو ہر مادی کے قبول کرنے سے (جو فلاسفہ کے نزدیک ذہن میں تصورات حسی کو نتیجہ کرتا ہے) یہ زیادہ آسان ہے کہ ہم ایک اپنے ہی جیسے لیکن زیادہ وسیع القدرت زیادہ حکیم، غرض ہر حیثیت سے ایک کامل روح یا نفس کا وجود تسلیم کر لیں جو انسانی اذنان پر منحصر ہے، اور اپنے ہی ہستہ رکردہ اصول کے ماتحت، جنگو حکمت کی زبان میں قوانین فطرت کہا جاتا ہے ان ذہنون میں تصورات خلق کرتا رہتا ہے، بس تو

کا کوپرنیکس ہے، جس طرح کوپرنیکس کے انکشاف نے ہزار ہا سال کے نظامِ ہمیت کو بالکل الٹ دیا، اور متحرک کو ساکن، ساکن کو متحرک کر دکھایا، اسی طرح مساوی کے نظریۃ الحیات نے فلسفہ کا رخ ادھر سے اُدھر پھیر دیا۔ جس چیز کو (مادہ) سیکڑوں ہزاروں سال سے قدیم و جدید فلاسفہ ناقابلِ انکار حقیقت یقین کرتے چلے آتے تھے وہ محض دھوکے کی ٹٹی اور ایک فرضی شے نکلی۔ مل نے لکھا ہے کہ برکلی کے مابعد و ما قبل کے فلسفہ میں اتنا ہی عظیم الشان فرق پیدا ہو گیا ہے، جتنا قدیم و جدید تاریخ یا طبیعیات میں ہے۔

ہم کو اصل میں اسی کتاب نے اسپرکامادہ کیا کہ ہندوستان کی وسیع ترین زبان کو فلاسفہ کے زمرہ میں سب سے اول برکلی سے واقفیت کا شرف حاصل ہونا چاہیے، کتاب کے اصلی مباحث سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو کل کتاب کا تقریباً ایک ربع ہے، اس میں تمام تر اس پر بحث ہے کہ تصورات مجردہ یا کلیات کا ذہن میں مطلق وجود نہیں۔ اسپربرکلی نے بہت زیادہ زور اسلے دیا ہے کہ اسکے نزدیک مادہ کا اعتقاد عقیدہ تجریدی کے سیئات میں داخل ہے۔ مل نے تو اس کو برکلی کے اُن اکتشافات ثلاثہ میں شمار کیا ہے جن میں سے ہر ایک بجائے خود اسکی عظمت کے لیے کافی ہے۔ بقیہ دو جدید نظریہ رویت، اور مادی کا نظریہ الہیات ہیں، چونکہ اپریل ۱۸۷۷ء کے معارف میں تصورات کلیہ کے عنوان سے اسی بحث پر ایک تفصیلی مقالہ شائع ہو چکا ہے، اس لیے مجوف طوالت ہم یہاں اسکو نظر انداز کرنے ہیں۔ باقی اصل کتاب کو خود صفت نے تین مباحث پر تقسیم کیا ہے جن میں سے اول نظریہ کی تشریح و اثبات ہے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

۱۔ دعویٰ یہ ہے کہ ذہن اور ادراکات ذہنی کے ماورائیات میں کسی تیسری چیز کا وجود نہیں ثابت ہوتا۔ ہمارے نزدیک اس دعویٰ کے متعلق ایک سوچنے والے آدمی کی تشفی کے لیے شروع کے دو بندوں میں پہلے نے جو کچھ کہ دیا ہے بس وہی بالکل کافی ہے۔ انسان جو کچھ جانتا ہے۔ اگر اسکی تحلیل کیجائے تو اصولاً کل تین چیزیں نکلیں گی۔ (۱) وہ احساسات جنکا براہ راست آلاتِ حس سے علم ہوتا ہے (۲) لذت و المِ محبت و نفرت، غصّہ و خواہش وغیرہ کے جذبات اور ارادہ (۳) حافظہ اور تخیل کی مدد سے ان دونوں کا اعادہ ذہنی۔ انکی باہمی ترکیب و تحلیل اور دوسرے تصرفات ذہنی جنکو فکر و استدلال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ موخر الذکر دونوں اصناف کے تو ذہنی اور محض ذہنی ہونے میں کلام ہی نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خارج از ذہن ان کا کوئی وجود نہیں۔ گفتگو صرف اول الذکر میں ہے۔

آلاتِ حس سے ہم کو، رنگ، امتداد، ذائقہ، آواز، بو، سردی، گرمی، سختی، نرمی وغیرہ کے مختلف اور ان گنت احساسات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جب چند خاص خاص احساسات ہمیشہ ایک ساتھ محسوس ہوتے ہیں تو ان کے لیے زبان میں کوئی ایک مستقل نام پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب ایک خاص ذائقہ رنگ و بو اور شکل و صورت کا برابر کیجا اور ایک وقت اور اک ہوتا ہے تو اس کو ہم سب کہتے ہیں۔ عوام الناس اسی مجموعہ احساسات کو موجود فی الخارج شے خیال کرتے ہیں، لیکن فلاسفہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں یہ تمام احساسات محض صفاتِ اعراض ہیں جنکی تہ میں ایک جوہر یا محل ہے، جسکے ساتھ یہ قائم ہیں حقیقی اور مستقل بالذات وجود صرف اس محل کا ہے۔ یہ خود ناقابلِ حس و ادراک ہے، اعراض کی وساطت

جو اس اصول جدید کے ماننے سے حاصل ہوتے ہیں، فلسفہ یا الہیات کی بہت سی گتھیاں، جنگی پیچیدگی ہزار ہا سال کی فکر و بحث کے بعد بھی اور بڑھتی جاتی ہے۔ از خود کھل جاتی ہیں۔ مثلاً ”آیا جو ہر جسمی میں قوت فکر ہے یا نہیں۔ مادہ لائی نہایت منقسم ہے یا نہیں اور یہ مادہ نفس پر کیونکر عمل یا تصرف کرتا ہے“ اس قسم کی تمام مشکلات جو ایک بے ذہن اور غیر محسوس جوہر کے خارج از نفس ماننے سے پیدا ہوتی ہیں، دفعۃً فلسفہ کے حدود سے شہر بدر ہو جاتی ہیں۔ ارتیا بیت کا جو مذہب کی سب سے خطرناک دشمن ہے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا دار و مدار سراسر شہادت جو اس کی تکذیب اور مادہ کے وجود خارجی پر ہے ”زنگ شکل حرکت“ امتداد وغیرہ کی نسبت اگر خیال کر لیا جائے کہ وہ محض ذہن کے احساسات ہیں تو وہ پوری طرح معلوم ہیں، اور ان میں کوئی شے نہیں رہ جاتی جو نامحسوس ہو، لیکن اگر انکو خارج از ذہن موجودات کا عکس یا نشی قرار دیا جائے تو قدر تاہم ارتیا بیت میں پھنس جاتے ہیں..... (کیونکہ اس صورت میں) اشیاء خارجی تو علی حالہ باقی رہتی ہیں لیکن ہمارے احساسات یا تصورات میں اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے، اب یہ فیصلہ کرنا ہمارے بس سے باہر ہے کہ ان مختلف تصورات میں سے کون سا تصور یا سرے سے کوئی بھی، اس حقیقی صفت کی نمایندگی کرتا ہے جو فی نفسہ خارج از ذہن شے میں موجود ہے، لہذا جو کچھ ہم دیکھتے سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ محض دہم و تخیل ہو۔“

خود اصل کتاب یعنی مبادی میں متعدد نقص تھے بعض مقامات ناصاف اور گنجلک تھے، ترتیب بھی ذرا ناقص ہے۔ تکرار اور اعادہ بھی

بہت ہے کہیں کہیں حد سے زیادہ اجمال ہو گیا ہے چنانچہ ان نقائص کا خود برکے کو بھی سہل
 ہوا اور بیس سال بعد جزیرہ رہوڈ سے سیمول جانس کے نام خط میں لکھا ہے کہ جو کچھ
 آپ نے دیکھا وہ اس وقت چھپا تھا جب میں بالکل نو عمر تھا اور بلاشبہ اس میں بہت
 سے نقائص ہیں۔ کیونکہ اگرچہ خیالات اپنی جگہ پر صحیح ہوں (جیسا کہ مجھ کو یقین ہے) تاہم
 چونکہ زبان عام استعمال اور سلمات کے لیے ڈھل گئی ہے اس لیے ان کا وضاحت
 کے ساتھ بیان کرنا نہایت مشکل ہے، لہذا میں ادعا نہیں کرتا کہ میری کتاب میں (نظر یہ رہے)
 بھی داخل ہے، کیونکہ اسکے عیسایانہ اور ژولیدہ ہونے کی لوگوں کو مبادی سے زیادہ
 حکایت تھی (صدائق کی معلوم ہو سکتی ہیں، میں جو کچھ امید رکھتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ خود
 اپنے ذہن و خیالات پر غور کرنے سے تجسس آدمیوں کے لیے یہ کتابیں صدائق
 یابی کا آلہ بن سکتی ہیں۔ ان اسباب کی وجہ سے لازماً برکے کے خیالات کی نسبت بہتوں کو
 غلط فہمیاں ہوئیں۔ مخالفین کے اکثر اعتراضات انہی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں جن لوگوں
 کو فلسفہ سے زیادہ مذاق نہ تھا ان کو اور بھی دقت پیش آئی۔ چنانچہ برکے کا خود ایک دوست
 جان پرسیول اسکو لکھتا ہے: ”اگر میں اس کتاب کو پڑھوں بھی تو بھی پوری طرح سمجھ
 نہ سکوں گا“ کیونکہ میں نے فلسفہ کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ لہذا ہنر کتاب کے مہات
 مباحث کو اختصار کے ساتھ ذرا صاف کر کے اوپر لکھ دیا ہے۔ لیکن جو لوگ معقولات
 سے ذرا گہرا مذاق رکھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ خود مبادی کو غور سے اور خالی الذہن
 ہو کر، بلکہ ہو سکے تو ایک سے زائد بار پڑھیں۔ کیونکہ بے اسکے نہ تو وہ کتاب کے عیب
 و ہنر سے واقف ہو سکتے ہیں نہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ نہ اس نظر سے

کہنا چاہیے کہ برکے کے نظام فلسفہ کے تین عناصر ترکیبی ہیں ذہن انسانی، خدا، اور وہ تصورات حسی، جنکو خدا انسان کے ذہن پر نقش کرتا رہتا ہے، جس سے باہر ان کا کوئی وجود نہیں، یا ایک لفظ میں یون کہو، کہ مادہ اور روح کی دونوں کو مشاکرہ خاص فلسفہ روحی برکے کا فلسفہ ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں (بندہ ۳ تا ۸) ان مختلف اعتراضات کا جواب ہے جو اس نظریہ پر کیے جاسکتے ہیں۔ یون تو تعداد میں یہ ایک وجہ سے زائد ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض مکرر اور بعض بالکل سطحی ہیں۔ اسلئے یہاں صرف چار پانچ کا جو نسبتاً اہم ہیں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب آدمی کو تمام چیزیں اپنے لئے الگ مختلف فاصلوں پر آنکھ سے علانیہ نظر آتی ہیں، تو پھر وہ ان کو محض ذہنی کیسے قرار دے سکتا ہے یہ اعتراض اس لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور قابل غنا تھا کہ اشیاء کے وجود خارجی کا اذعان سمجھنا چاہیے کہ سرتاپا اسی پر مبنی ہے، اسلئے سب سے اول برکے نے تجدید نظریہ رویت، لکھکر اس کا قلع قمع کیا اور موافق و مخالف سب سے منوالیا کہ فاصلہ براہ راست مرئی نہیں اور اسکو محسوس بصر سمجھنا ایک دھوکا ہے۔

(۲) اس اصول کی بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ تمام چیزیں محض ذہنی اور خیالی ہیں۔ حقیقی آگ جو جلاتی ہے اس میں اور اس کے ذہنی تخیل میں کوئی فرق ہی نہیں۔ جواب یہ ہے کہ نہیں ان دونوں میں وہی فرق ہے جو واقعی درد اور اس کے محض تخیل میں۔ لیکن پھر بھی یہ کوئی نہیں کہتا کہ واقعی درد اور محسوس کرنے والے سے باہر موجود ہے، یا نفس احساس کے علاوہ اس کا کوئی اور وجود ہے۔

جب اپنی ذہانت کا استعمال کرے تو اسکی دل شکنی نہ کرنی چاہیے۔ لیکن یہ باتیں کچھ نئی اور چندان قابل تعجب نہیں ہیں، عقیدہ عام کے خلاف جب کوئی عظیم تحقیق و انکشاف پیش کیا گیا ہے تو شروع شروع میں ہی سلوک ہوا ہے۔

مصنف کی زندگی میں مبادی دوبار چھپی، جب پہلا ایڈیشن نکلا، تو اُسپر حصہ اول لکھا تھا، دوسرا حصہ لکھ کر اٹلی کے اٹناے سفر میں کمین ضائع ہو گیا۔ لیکن اس حصہ دوم کے کیا مباحث تھے، اس کا کسی قدر اندازہ خود برکلی کے ایک خط سے ہو سکتا ہے جو اسنے حصہ اول کی طبع کے وقت لکھا ہے۔ ”اس کتاب کا مقصد خدا کا وجود اور اسکے صفات کی توضیح و اثبات، روح کی ابدیت، خدا کے علم غیب اور انسان کے اختیار کا تحقیق ہے۔ اور حکمیات نظری کے متعدد حصوں کی مہمیت اور کذب کی پردہ دری کر کے لوگوں کو مذہب اور سود مند چیزوں کے مطالعہ کی طرف مائل کرنا ہے۔“ ان میں سے بعض باتیں تو حصہ اول میں اشارتاً اور اجمالاً آگئی ہیں۔ اور بعض بالکل نہیں ہیں، دوسرے حصہ میں غالباً انہی پر مفصلاً بحث ہوتی۔ اگر ہمارا قیاس صحیح ہے تو اس کا رنامہ کے تلف ہو جانے کا فلسفہ سے زیادہ علم کلام کو احساس ہونا چاہیے۔

۳۔ مکالمات مابین مائلس و فلونس

برکلی کو مادہ کے عدم وجود کا اتنا ہی اذعان تھا، جتنا تمام دنیا کو اسکے وجود کا ہی ساتھ ہی اس کو یہ بھی یقین تھا کہ اسکے خیالات کو توجہ سے سننے کے بعد قطعی بہت سے انصاف پسند آدمی ہم آہنگ ہو جائیں گے، ایسے نظریہ جدید اور مبادی کے ساتھ

جو ناقدری اور بے اتفاقی کا سلوک ہوا تھا، اس سے شکستہ خاطر ہو کر، وہ بچلا نہیں ٹیٹھ سکتا تھا، ابکی اسنے فلاسفہ کے محدود دائرہ سے نکل کر وسیع تر پبلک میں اپنی آواز کو مسموع بنانے کی کوشش کی۔ مبادی کا اسلوب علاوہ بعض جزئی نقائص کے خالص فلسفیانہ تھا، مکالمات اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے اگرچہ مبادی ہی کا نقش ثانی ہیں۔ لیکن نو مشقی کے عیوب اس سے قدرتا دور ہو چکے تھے، اسکے ماسوا بالقصد مصنف نے اسکو بہت زیادہ سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی، زبان کا لطف بھی بڑھ گیا۔ کمین کمین انشا پردازی کا بھی چٹخارہ ہے، اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ مکالمہ کا اسلوب ہی قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حریف کے اعتراضوں کا جواب زیادہ خوبی سے دیا جاسکتا ہے مشکل سے مشکل سلسلہ باتوں باتوں میں نشین ہو جاتا ہے، اور پڑھنے والے کو بوجہ نہیں معلوم ہوتا۔

ان تمام چیزوں کا ملکیہ اثر ہوا کہ جو شخص (پرسیول) مبادی کو اپنی فہم سے بالاتر خیال کر کے پڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا، اسنے لکھا کہ ”سچ یہ ہے کہ پہلے کی نسبت اب میں آپکا بہت زیادہ ہم خیال ہو گیا ہوں، اقلّا اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ آپ کا خیال بھی اُس قدر اغلب ہے جتنا وہ خیال جسکی آپ تردید کرتے ہیں، اور کم از کم دونوں برابر درجہ کی دشواریوں سے دوچار ہیں۔“ مکالمات کے قبول عام کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ برکلے کی زندگی ہی میں اسکے میں یریشننگل فرامیسی میں نہایت اہتمام سے ترجمہ ہوا اور اسکے انتقال کے تین ہی برس بعد جرمن میں ترجمہ ہو گیا۔

تعداد میں یہ مکالمات کل تین ہیں۔ موضوع بحث کے اتحاد کے ساتھ کہنا چاہئے کہ ترتیب و ضخامت بھی (۱۰۰ صفحہ) بالکل مبادی ہی کی ہے۔ البتہ مبادی پر جو بعض نے اعتراض کیے گئے تھے، ان کا جواب زیادہ تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت

لہ بلیک ڈو برکلے صفحہ ۸۰۔

یہ ہے کہ دوسو سال کی مدت میں برکے کے فلسفہ پر مخالفین اور ناقدین نے جو جو نقص یا اعتراضات پیش کیے ہیں، وہ سب مع اپنے توڑ کے صراحتاً یا ضمناً خود مبادی ہی میں موجود ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ اہم تھے انکو ہم تلخیصاً مبادی کے اور مباحث کے ساتھ اوپر بیان کر چکے ہیں، اسکے علاوہ ہمارے مشہور اور عزیز ترین دوست مسٹر عبد الماجد خود ان مکالمات کا ترجمہ کر رہے ہیں، اور امید ہے کہ فلسفہ برکے سے کچھ ہی آگے پیچھے شائع ہو۔ ہم اپنے انسانی فطرت شناس دوست کے انتخاب کی اس حیثیت سے داودیتے ہیں کہ اردو میں مبادی سے پہلے مکالمات کا شائع ہونا زیادہ موزون تھا، جو لوگ مبادی کے خالص فلسفیانہ، خشک و بد مزہ اسلوب تحریر کے پڑھنے کی تاب نہ لاسکیں ان سے ہماری التجا ہے کہ برکے سے صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لیے کم از کم ایک بار توجہ سے مکالمات کو تو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارہ کریں۔ لیکن یہ پیش نظر ہے کہ ناول یا ڈراما وہ بھی نہیں ہے۔ ہے فلسفہ ہی

۴۔ ڈی ماٹو

یہ علت و معلول کی بحث پر لاطینی زبان میں ۲۰، ۲۵ صفحہ کا رسالہ ہے۔ ہم لاطینی سے نابلدی کی وجہ سے اسکی نسبت کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے، لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کے مہمات مباحث میں داخل ہے، ایسے برکے کے فلسفیانہ مصنفات کے ذیل میں اسکا کم از کم نام لے لینا ضرور تھا۔ فریئر نے فٹ نوٹ میں چند سطرین اسکے خلاصہ کے طور پر لکھ دی ہیں۔ ہم انہی کے بھروسہ پر چند لفظ عرض کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام چیزوں میں باہم علت و معلول یا تاثیر و تاثر

کا ایک فطری علاقہ ہے مثلاً جب تم برف ہاتھ میں لیتے ہو تو ٹھنڈھک محسوس ہوتی ہے جس سے تم یہ سمجھتے ہو کہ برف کی ذات یا ماہیت ہی میں کوئی ایسی بات (قوت) ہے جو یہ اثر پیدا کرتی ہے اور برف جب تک برف ہی اس سے یہ اثر منفک نہیں ہو سکتا لیکن برکے کے نزدیک جس طرح یہ اثر یعنی ٹھنڈھک صرف تمہارا ذہنی احساس ہے اور اس لیے محض ایک انفعالی شے ہے، اسی طرح برف کا وہ کچھ جو اس کو تم فاعل اور موثر جانتے ہو اس کی حقیقت بھی تمہارے تصور ذہنی سے زیادہ نہیں (مبادی) اور مکالمات ہائے فلسفہ میں یہی ثابت کیا گیا ہے) اس لیے لازماً وہ بھی ایک منفعل چیز ہے، اور علت یا موثر جس کی حقیقت میں فاعل ہونا شامل ہے، نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ برف اور ٹھنڈھک میں کوئی لازمی تعلق نہیں، بلکہ تجربہ کی بنا پر ایک کا تصور دوسرے کا تصور پیدا ہونے کی نشانی بن گیا ہے۔ چنانچہ اگر تجربہ سے یہ ثابت ہوتا کہ برف سے گرمی کا احساس ہوتا ہے تو ہم اس کو گرمی ہی کی علامت یا بہ اصطلاح معروف یہ کہہ کر علت سمجھنے لگتے۔ یہی وہ خیال ہے، جو ہیوم کے مشہور نظریہ تعلیل کا سنگ اساس ہے۔ برکے اس میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتا کہ زندگی کے کاروبار میں عملی سہولتوں کے لیے ان علامت کو ظاہر یا میکانکی علل قرار دے لیا جائے لیکن حقیقی اور فاعلی علت اس کے نزدیک صرف ارادہ روح ہے۔

دی ماٹو کا یہ نظریہ تعلیل، فلسفہ مبادی کی محض ایک تفریع (کاررواری) ہے، یہ سالہ برکے کی خالص فلسفیانہ تصنیفات کا آخری کارنامہ ہے۔ اسکے بعد جن دو کتابوں کا ذکر آتا ہے وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے براہ راست فلسفہ سے متعلق نہیں۔

۵۔ مکالمات السیفارن

یہ برکے کی تصانیف میں سب سے ضخیم تر ہے (صفحہ ۳۲۰) نظریہ رویت، مبادی، اور مکالمات، اہل سنت میں ملکر بھی اسکے برابر نہیں ہیں۔ ادبی حیثیت سے برکے کے مکالمات فلاطون اور سسرو کے مکالمات کے ہم پایہ گئے جاتے ہیں۔ لیکن معنوی حیثیت سے مل اور اسٹیفن وغیرہ کے خیال میں السیفارن اگر اتنے بڑے شخص کی لکھی ہوئی نہ ہوتی تو کسی خاص اعتنا کی مستحق نہ ہوتی، برکے جیسے بلند رتبہ مصنف کا یہ سب سے کم قابل قدر کارنامہ ہے۔ زیادہ تر معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں پر مشتمل ہے ہمارے نزدیک یہ رائے کسی قدر مبالغہ آمیز ہے، البتہ اتنا سچ ہے کہ بحیثیت مجموعی نظریہ جدید اور مبادی کے مصنف کی شان سے پست تر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ السیفارن تمام تر کلامی مباحث کا مجموعہ ہے، اسلئے قدر تا وہ ایک خالص فلسفیانہ نگاہ میں نہیں چھتی۔ اور اسلئے اس پر تفصیل سے بحث کرنا ہمارے موضوع کی وسعت سے بھی خارج ہے۔ اس کی کلامی نوعیت بحث کی جانب ذرا سا اجمالی اشارہ کر کے ہم علم الاخلاق کے اس نظریہ پر البتہ توجہ دلانا چاہتے ہیں جو اس میں اگرچہ ضمناً آگیا ہے لیکن درحقیقت وہ اس فلسفہ اخلاق کا اساس ہے جس کا امام اعظم غررِ خصال کیا جاتا ہے۔

اس مجموعہ میں سات مکالمے ہیں السیفارن، جو ان ساتوں کا مشترک گیرِ کٹر

لے رومہ کا مشہور سیاسی اور خطیب و مقرر اسکے ق۔ م۔ میں مرا۔ فلاطون کی طرح اسے بھی اپنے اکثر فلسفیانہ اور سیاسی خیالات مکالمات کے پیرایہ میں لکھے ہیں۔ فلاطون سے استفادہ کا مترقبہ ہے۔

۱۰ دیکھو ڈسٹرینس صفحہ ۱۷۹ اور English Thoughts in ۱۸th Century ج ۱۲ صفحہ ۴۳۔

ہے اسی آزاد خیال گروہ کا نمائندہ اور کیل ہے، جس کے مقابل میں گارمین کے مضامین لکھے گئے تھے، اور جو اطاعت، غیر متقا دمانہ، انالٹ، مقالہ بنام مکام وغیرہ کی تحریک کا محرک تھا، برکھے کے کلامی اور اخلاقی نظریات کے لیے مکالمات ایفان کے ساتھ ان رسائل کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کے افعال و اعمال پر اس کے خیالات اور عقائد کا بجا اثر پڑتا ہے، اس لیے ایسے عقائد جو نیکو کاری کی جانب مائل کرنے اور بد کاری سے بچانے میں معین ہوں، ان کو قائم رکھنا چاہیے۔ مذہب کی تعلیمات یعنی وجود خدا، معا و جزا وغیرہ کا اذعان اور فرائض اخلاقی کا احساس اسی قسم کے عقائد میں شامل ہیں۔ یہ مذہبی اور اخلاقی خیالات اگرچہ مختلف اقوام و ممالک میں بے انتہا تفاوت نظر آتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ اسی طرح فطری ہیں جس طرح ایک ہی بیج زمین، آب و ہوا، اور طریق پرورش کے اختلاف سے، مختلف رنگ، ذائقہ، اور بو باس کے پھل پھول پیدا کرتا ہے۔ شروع کے تین مکالمات میں انہی چیزوں پر تفصلاً گفتگو ہے، مگر ان تمام باتوں کو قبول کرنے پر بھی، اس شخص کی تسلی نہیں ہو سکتی، جو سچائی کا ستلاشی ہے کسی اعتقاد کا مفید ہونا اور بات ہے اور اس کا دافعی وجود اور چیز ہے۔ یہ مان لیا کہ وجود خدا کے عقیدہ کو دلوں میں باقی رکھنا سودمند ہے، لیکن اس سے یہ کیسے نکلا کہ خدا واقعا بھی موجود ہے، اس لیے چوتھے مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا کی موجودیت کا اسی دلیل سے علم حاصل ہے جس سے ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو براہ راست صرف اپنے افعال نفس کا علم ہوتا ہے، وہ اپنے ارادہ سے اپنے جسم میں مختلف حرکات پیدا کرتا ہے، بولتا ہے،

چلتا ہے، اٹھتا ہے، بیٹھتا ہے، اس لیے جب وہ کسی دوسرے جسم میں اسی قسم کی حرکات کا نشانہ کرتا ہے تو اس کا ذہن اپنے ہی جیسی ایک دوسری ذی ارادہ ذات کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسی کے ایسے اور اذہان و نفوس بھی موجود ہیں جنکو وہ بالذات محسوس نہیں کرتا بلکہ گفتگو یا حرکات جسم کے علامت سے ان کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ اسی طرح اگر حواشی کائنات کی تحلیل کی جائے، تو وہ بھی مختلف طرح کے حرکات نکلیں گے، جنہیں اسی درجہ کا بلکہ اس سے بڑھ کر نظم و نسق ہے جتنا انسان کے حرکات ارادی میں ہوتا ہے۔ لہذا اس عالم کی مشین کے لیے ایک محرک ارادی کا وجود قطعی ہے، اس کے علاوہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہمارے محسوسات میں باہم علت و معلول کا کوئی لزومی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک احساس سے دوسرے کی جانب اسی طرح ذہن کا انتقال ہوتا ہے جس طرح کسی لفظ سے اس کے معنی کی طرف۔ لہذا جس شے کو حکماً تو انین فطرت سے تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل لسان الہی ہے، جو ہم سے ہر آن اسی طرح ہم کلام ہے جس طرح ایک آدمی دوسرے آدمی سے، باقی اخیر کے تین مکالموں میں عیسائیت کے مخصوص عقائد و تعلیمات کی حمایت کی ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہونے کے علاوہ اُردو پبلک کے لیے نہایت غیر دلچسپ حصہ ہے۔ لہذا اسکو چھوڑ کر سیدر بسط کے ساتھ ہم اس نظریہ اخلاق کو ذیل میں درج کرتے ہیں، جو ابتدائی تین مکالموں میں اگرچہ مذہبی مباحث کے ضمن میں مذکور ہے۔ لیکن بجائے خود فلسفہ کے مہمات ابواب میں داخل ہے، اور اس لیے ہمارے دائرہ بحث کے اندر ہے۔

لے دیکھو ذکر ڈماٹو صفحہ ۲۵ ۲۶ ہم نے بے حد اجمال سے کام لیا ہے۔ انگریزی و لنون کو چاہیے کہ جو مکالمہ کو خود پڑھیں کہ خدا کیونکر انسان سے باتیں کرتا ہے، نہایت دلچسپ ہے۔

اخلاقیات کے بیسیوں مذاہب میں جو مذہب سب سے زیادہ محقق اور یورپ

خصوصاً انگلستان میں مقبول ہے، وہ افادیت ہے، جس کے ائمہ بہتم، مل اسپنسر وغیرہ
ہیں افادی فلسفہ اخلاق کی بنیاد دو اصولوں پر ہے (۱) انسان کی خواہشات اور
اس کے افعال کے محرکات کو اگر تحلیل کر کے دیکھا جائے تو وہ سب بلا استثنا کسی نہ کسی طرح
کے لطف و لذت کی طلب اور بچ دالم سے اجتناب پر مبنی ہوتے ہیں ساتھی ایک
بڑی مسرت یا لذت کے حصول کی خاطر آدمی چھوٹی چھوٹی تطیفون کو خوشی سے انجیز
کرتا ہے، اور معمولی یا ادنیٰ درجہ کی مسرتوں کو اس پرستربان کرتا رہتا ہے (۲) لیکن چونکہ
ہر فرد انسان کی لذت و راحت دوسرے افراد یا جماعت کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے
جس طرح کسی جسم کے مختلف اعضا کی اپنے کل کے ساتھ، ایسے لازماً ہر آدمی کو اپنے انفرادی
افعال میں اجتماع کا ماتحت رہنا پڑتا ہے، اور جماعت کی فلاح و بہبود بالواسطہ افراد کی
فلاح و بہبود ثابت ہوتی ہے۔ لہذا وہ افعال جو انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد کے لیے
بڑی سے بڑی مسرت کا موجب ہوں۔ نظریۂ افادیت کی رو سے مستحسن ہیں۔ اور اسکے
خلاف قبیح یا دوسرے لفظوں میں یون کہو کہ یہی اصول خیر و شر کے امتیاز کا معیار ہے۔ اسی
معیار کا پتہ لگانا فلسفہ اخلاق کا معرکہ الاراسلہ ہے۔ برکلی نے ان دونوں اصولوں کو
جس خوبی اور وضاحت سے بیان کیا ہے، ہم بعینہ اسکو درج کرتے ہیں۔

”جو اصول سب سے زیادہ عالمگیر اور انتہائی گہرائی کے ساتھ ہمارے دلوں پر

نقش ہے وہ اپنی ذات کی محبت کا اصول ہے (۱) ایسے قدرتی طور پر ہم تمام چیزوں کو
اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ہماری ذاتی مسرتوں کی افزائش کے لیے موزوں ہیں یا نہیں۔

۱۔ دیکھو اطاعت غیر مفادمانہ بندہ۔

اور اسی نقطہ نظر سے ہم انکو خیر یا شر کا لقب دیتے ہیں..... ہماری زندگی کی تمام تر خوشنیت
 اول الذکر کے حصول اور ثانی الذکر سے اجتناب پر مبنی ہے۔ پہلے پہل جب ہم دنیا میں
 داخل ہوتے ہیں تو ہماری رہنمائی کلیتہً حواس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت فوری
 حسی لذت و الم ہی بڑے پہلے کا معیار ہوتا ہے، لیکن جیسے جیسے چیزوں کی ماہیت
 کے متعلق ہماری واقفیت بڑھتی جاتی ہے، ویسے ویسے ہمکو تجربہ سکھاتا جاتا ہے کہ اکثر
 فوری لذت آگے چلکر ایک بڑے الم کا باعث ہوتی ہے۔ ساتھی فوری تکلیف بار ہا
 آئندہ مسرت کا موجب ہوتی ہے..... لہذا ہمارے فیصلوں میں ایک تغیر واقع ہوتا ہے
 اب ہم آلات حس کی اولین طلب پر اطاعت کے لیے نہیں مستعد ہو جاتے، بلکہ اس پر
 غور کرتے ہیں کہ حسب معمول اس عمل سے آئندہ کس لذت کی توقع یا کس الم کا خوف ہو سکتا
 ہے۔ یہ خیال بار ہا ہمکو ان فوری لطف اندوزیوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیتا ہے
 جن کے مقابلہ میں آئندہ زیادہ بڑی اور پائیدار مسرتوں کی امید بندھ جاتی ہے.....“
 (۲) کسی ”آدی کو یہ نہ چاہیے کہ وہ اپنے کو ایک ایسا مستقل فرد سمجھ بیٹھے۔ جسکی مسرت
 دوسروں کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ اپنے کو ایک کل کا جز جانیے
 اور اس کل کی مشترک فلاح کا ماتحت و متبع رہے، اور اپنے عادات و افعال میں ایک
 موزون ترتیب قائم رکھے۔ بہ شرطیکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے۔“
 جس صراحت کے ساتھ برکھ نے افادیت کے مہمات مبادی کو پیش کیا ہے
 اس کے بعد یہ نہایت نا انصافی ہوگی اگر اس کو نتیجہ اور مل کا پیشرو نہ قرار دیا جائے۔ البتہ
 اسنے اپنی افادیت کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اسکے نزدیک چونکہ انسان کی سب سے

بڑی مسرت اور ابدی سعادت و بختی ایک برتر ہستی (خدا) کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے تمام انسانی افعال اُسی کی مشیت و احکام (مذہب) کے ماتحت رہنے چاہئیں۔ اور اُسکی وعدہ کی ہوئی لازوال مسرتوں کے مقابل میں دنیا کی عارضی اور قانونی لذتوں کو بیچ سمجھ کر ان پر نظر نہ ڈالنا چاہیے۔ اسی بنا پر برکھے کے فلسفہ اخلاق کو مذہبی افادیت کا لقب دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اسکی پیش روی کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ اور ہمارے نزدیک سڈگوک اور اسٹفن وغیرہ نے اس حیثیت سے اسکی جانب سے بے اعتنائی کرنے میں انصاف کا خون کیا ہے۔

۶۔ سرس

یہ کتاب برکھے کی علمی زندگی کی کہنا چاہیے کہ سب سے آخری یادگار اور اس کے معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ الف لیلہ کی طرح بات سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔ اصل میں تو مارالقیمر کے طبی فوائد کی بحث شروع ہوتی ہے، اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ تمام امراض کے لیے اکیسر ہے، قیر چونکہ بعض پر دون سے پیدا ہوتا ہے، ایسے نباتی زندگی کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ پھر نباتی ایڈ جوہر حیات قرار پا کر علم کیمیا کے مسائل کا ذکر نکلتا ہے۔ غرض اس تسلسل کی گرفت سے تشریح، عضویات، علم المرایا، میکاٹک وغیرہ علوم طبیعہ کی کوئی شاخ نہیں بچ سکی۔ یہاں تک کہ بالآخر مابعد الطبیعات کے مباحث پیدا ہوتے ہیں، جنکی لپیٹ میں تمام قدیم فلاسفہ کے مذاہب ایک ایک کر کے آجاتے ہیں۔ اس ساری داستان کی تان آخر میں چکر اسی فلسفہ مبادی پر ٹوٹتی ہے، کہ تمام کائنات طبیعہ کا مبدی شخص ایک فعال روح ہے، سارا عالم اسی کا پر تو ہے، اور حقیقی وجود صرف اسی کا ہے۔

آخر کے حصہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام متقدمین فلاسفہ، فیثاغورس، پرمائیدس، فلاطون، فلاطین، وغیرہ اسی ایک مبداً روحی کے حقیقی وجود کے قائل ہیں۔ ارسطو تک کے نزدیک مادہ سے مراد کوئی جو ہر جسمی نہیں ہے، نہ وہ فیکر اٹیس یا زمانہ حال کے مادیین کی طرح جو ہر مادی کو ساری کائنات کی اصل قرار دیتا ہے، لہذا برکلی کے نزدیک ان لوگوں کی نظریات بہ نسبت ڈیکارٹ و نیوٹن وغیرہ فلاسفہ حال کے خود اس کے نظریہ سے قریب تر اور اسی لیے صحیح ترین۔ فلاسفہ یونان میں وہ سب سے زیادہ جس شخص کی عظمت کا معترف ہے، وہ فلاطون ہے، لکھا ہے کہ آج بھی دنیا کو فلاطون کی احتیاج ہے۔ اور اسکی نصایف کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

سرس برکلی کے تمام نوشتجات میں ہمہ گیر واقفیت اور دست نظر کے لحاظ سے بے حد حیرت انگیز ہے۔ قدیم و جدید مشرق (مصر) و مغرب کے حکما (سائنٹسٹ) و فلاسفہ میں شاید ہی کوئی قابل ذکر نام ایسا نکلے، جو اس میں نہ آیا ہو محض نام نہیں گنائے گئے ہیں، بلکہ ہر شخص کے سائل و نظریات پر عبورانہ بحث ہے۔ قبول بھی سرس سے زیادہ کسی اور کتاب کو نہیں میسر ہوا۔ ۱۷۷۱ء میں اس کا پہلا ایڈیشن نکلا، چند ہفتے بعد دوسرا اور پھر تیسری ۱۷۷۳ء میں تیسرا ایڈیشن نکلا، اس کے بعد مصنف کی زندگی ہی میں ۱۷۷۶ء و ۱۷۸۵ء میں اور دو بار شائع ہوئی، فرانسیسی، جرمن، ڈچ، اور پرتگالی زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے، لیکن اسکی مقبولیت کا سبب الہیاتی مباحث سے بہت زیادہ مادی لائق کی طبی تحقیقات تھی جسے پیشہ ور اطباء کے حلقہ میں رقابت اور مخالفت کا جوش پھیلا دیا تھا۔ یہی جوش رقابت سرس کی شہرت و اشاعت عام کا ذریعہ بن گیا۔

برکے کا فلسفہ تصویریت

ہستی کے مت فریب میں آجائو اسد عالم تمام حلقہٴ دائم خیال ہے

فلسفہ نام ہے تلاشِ حقیقت کا۔ حقیقت سے کیا مراد ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟ عام آدمیوں کو عالم سراسر تغیر و تبدل، تمام تر کثرت و تعدد، اور یکسر اختلاف و تنوع نظر آتا ہے۔ لیکن ایک متحسب ذہن کو فوراً یہ کھٹکتا ہے کہ اس تغیر و تبدل کے اندر کوئی نہ کوئی ثبات و قیام، کثرت و تعدد کے پردہ میں کوئی نہ کوئی وحدت، اور اختلاف و تنوع کی تہ میں کوئی نہ کوئی اشتراک و یکگانگی پنہان ہے، جو ان تمام نیرنگیوں کا مبدع ہے، بس یہی مبدع وہ حقیقت ہے جسکی جستجو کے پیچھے فلاسفہ سرگردان ہیں۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ یہ حقیقت کہاں ہے؟ اور اس مبدع کائنات کی کیا ماہیت ہے؟ اسی سوال کے مختلف جوابات نے فلسفہ کے سیکڑوں فرقے پیدا کر دیئے۔

عالم کے بے شمار موجودات میں، دو چیزیں ایسی ملتی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل متخالف بلکہ متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ ایک کے مختصات میں شعور و ادراک، ارادہ اور سکروغیرہ داخل ہے، جس کو ذہن، نفس، روح، انا، اور ایغو کے متعدد ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، دوسرے کے خصائص، امتداد، طول، عرض و عمق، شکل، مربع، مثلث، مدور و مستطیل وغیرہ ہونا، حرکت وغیرہ ہیں۔ اس کو جسم یا مادہ

کہا جاتا ہے۔ جو فکر و ادراک سے اسی طرح عاری ہے جس طرح اول الذکر شکل و امتداد سے مبرا ہے۔

مادہ میں شعور و ادراک کا فرض کرنا اتنا ہی ناقابل تصور نظر آتا ہے، جتنا نفس کی ماہیت سے اس کو جدا کرنا، علیٰ ہذا نفس کو متدرج شکل ماننا اس قدر ناممکن التحیل معلوم ہوتا ہے بقدر مادہ کو شکل و امتداد سے منفصل کرنا۔ اسی لیے ایک جماعت کثیرہ قبول کرنے پر مجبور ہو گئی کہ عالم کا خیر روح اور مادہ دو مختلف الماہیت عناصر سے تیار ہوا ہے اسی دوئی کے قابل فرقہ کا اصطلاحی نام ثنویہ ہے جس کے علمبردار ارسطو، اور ڈیکارٹ وغیرہ ہیں۔ لیکن انسان کی فکر مضطرب اس دوئی پر بھی نہیں قرار پکڑ سکتی تھی۔ لہذا ایک طرف تو نہایت بلند آہنگی سے ایک گروہ نے یہ دعویٰ کر دیا کہ سارا عالم صرف ذرات مادی کا جلوہ گاہ ہے۔ مادہ کے ماوراء کسی اور شے کا مطلق وجود نہیں، ادراک و ارادہ وغیرہ کے افعال جنکو تم ایک غیر مادی ہستی (روح) کی جانباً منسوب کرتے ہو، وہ ذرات مادی ہی کی ایک خاص ترکیب اور باہمی تاثیر و تاثر کا ایک کرشمہ ہیں۔ یہی فرقہ مادیتین کے نام سے پکارا جاتا ہے، جس کے ذیل و مقبولین، بخمنہ وغیرہ ہیں دوسرے سرے پر اس کے بالکل خلاف روحیتین اسکے مدعی ہیں کہ حقیقی وجود فقط نفس یا روح کا ہے۔ باقی جس شے کو مادہ اور جسم کہا جاتا ہے وہ محض روح کا ایک فعل یا ظل اور پرتو ہے روحیتین اور مادیتین کا مشترک لقب وحدیہ ہے، ہمارا برکے کا اسی آخر الذکر مذہب یعنی روحیت کے اکابر ائمہ میں شمار ہے۔ اس مذہب کا وسیع ترین نام انگریزی میں ایڈیلزم ہے جسکی تحت میں روحیت کے تمام باہم لہ انیسویں صدی کا مشہور مادی۔ جو کچھ ہے بس سب مادہ ہی کا کرشمہ جو خدا اور روح وغیرہ بے خرافات ہیں

مختلف و متبادل نظریات داخل ہیں جنہیں بالعموم نہایت خلط مجبث کر دیا جاتا ہے۔ ہم ہر ایک کے نظریات اس کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر اور نمایان کرنے کے لیے ایڈلیزم کو دو اصولی اسکولوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) اگرچہ کائنات کے گونا گون تغیرات و حوادث کا حقیقی سرچشمہ صرف ایک غیر مادی ہستی یا روح ہے۔ لیکن یہ حوادث و تغیرات ادراک کرنے والے نفس یا ذہن سے باہر مستقلاً موجود ہیں۔ ان کا وجود نفوس مدرکہ کے ساتھ اس طرح نہیں وابستہ ہے جس طرح درد کا وجود درد کے احساس کرنے والے ذہن کے ساتھ ہوتا ہے۔ فلاطون اسپنوزا، بنز و غیرہ کی ایڈلیزم کا یہی منشا ہے۔ فلاطون کے نزدیک ہمارے محسوسات کی حقیقت اگرچہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ غیر مادی اور غیر محسوس روحی مٹشل کے محض اشباح و اظلال ہیں لیکن ان اشباح کا وجود و عدم احساس ذہنی پر مبنی نہیں۔ اسپنوزا بھی گو اس بات کا قائل ہے کہ جسم و روح دو مختلف و مستقل جوہر نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں ایک قسری روحانی ہستی (خدا) کے دو صفات یا مظاہر ہیں جنہیں سے ایک کمالا تلبا امتداد ہے اور دوسرے کا فکر جس کا یہ مطلب نہیں کہ امتداد کا وجود فکر کے ماتحت ہے۔ اسی طرح بنز نے ویقراطیس کے ذراستہ مادی کے بجائے اجسام کو غیر متدبیط، ناقابل انقسام، لیکن ذی ادراک ٹائوس (و خداستہ روحی) پر تحلیل کرنے کی کوشش کی، مگر یہ نہیں دعویٰ کیا کہ اجسام کا وجود احساس سے نیا و نہیں یا کسی جسم کا احساس ہی اس کا وجود ہے۔

(۲) انسان کو کسی صاحب ادراک ذی ارادہ اور غیر متد و غیر متشکل ذات (روح)

کے وجود کا خیال پیدا کیونکر ہوا؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے، یعنی خود اپنے

ذہن یا نفس کے افعال و خواص کا مطالعہ کرنے سے۔ اس لیے ایک دوسری صورت روحیت یا ایڈیلزم کی یہ تھی کہ تمام محسوسات (بہ الفاظ دیگر موجودات مادی) کو محض اپنے ہی نفس کے مختلف یکفیات و حوادث قرار دیا جائے۔ اور چونکہ انسان کو بالذات و براہ راست صرف اپنے ہی تصورات یا حوادث ذہنی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ لہذا یہ نظریہ روحیت زیادہ قریب الفہم اور زیادہ قابل قبول تھا۔ اور برکلی کے نزدیک تو یہ اُن حقائق میں داخل ہے۔ ”جو ذہن سے اس قدر قریب اور اس قدر بدیہی ہیں کہ ان کے دیکھنے کے لیے آدمی کو صرف اپنی آنکھیں کھولنے کی ضرورت ہے“ لیکن پھر بھی خود برکلی سے پہلے کسی شخص کو اس بے نقاب حقیقت کے مشاہدہ کے لیے چشم کشائی کی توفیق نہ میسر ہو سکی۔ ہم آسٹیلزم کی سابق الذکر صورتوں سے ممتاز کرنے کے لیے برکلی کے نظریہ کا نام **تصوریت** یا **تصوری آسٹیلزم** رکھتے ہیں۔

اگرچہ فلسفہ کی اس حقیقت عظیم کے انخشاف اور اس کی تکمیل دو دنوں کا فرحتنا برکلی کے حاصل ہے۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس نے سب سے اول راہ کھولی، وہ سوفسطائے کا مقدمہ بحیث پر وٹا گورس ہے ڈیکارٹ گو کہ صرف پہلا قدم بڑھا کر بے راہ ہو گیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخ تصوریت کا یہی سب سے اہم قدم تھا، جس کے بعد لاک نے آدھا راستہ طے کر لیا۔ لیکن اصل نکتہ تک پہنچنے میں صدیوں کے تعصبات کی آہنی دیوار حائل ہو گئی۔ اس کے توڑنے کے لیے فقط ایک مجتہد دماغ اور جبری قلب کی حاجت تھی جو برکلی قدرت سے لیکر آیا تھا۔ اور جس کے آثار بحیث ہی سے نمایان تھے۔ لہذا برکلی کے تاریخی مرتبہ اور اس کے مجتہدانہ اکتشاف سے پوری طرح واقف ہونے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ پہلے اجمالاً پر وٹا گورس، ڈیکارٹ اور لاک کے نظریات سے مطلع ہونا چاہیے

پروٹاگورس (۴۴۰ ق۔ م) سے پہلے فلاسفہ ذہنی شعور کو موجودات خارجی کا ماتحت قرار دیتے تھے، اسنے اس اصول کو بالکل الٹ دیا۔ ایک ہی چیز کی نسبت مختلف لوگوں کے مختلف احساسات ہوتے ہیں، بلکہ ایک ہی شخص مختلف اوقات و حالات میں مختلف و متباہن کیفیات محسوس کرتا ہے، لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہن سے باہر محسوسات کا کوئی مستقل وجود نہیں، بلکہ ہر چیز ادراک ذہنی پر منحصر ہے۔ انسان اپنے ادراکات کے ماوراء کچھ نہیں جانتا۔ جو چیزیں ہمارے احساس کے دسترس میں نہیں ہیں وہ ہمارے لیے موجود ہی نہیں۔ جزئیات محسوسہ کے علاوہ کسی شے کا اثبات ناممکن ہے، جس چیز کا کوئی آدمی نہیں ادراک کرتا اس کا کوئی وجود نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ”تمام چیزوں کا معیار انسان (ذہن انسان) ہے۔“ یہ خط زدہ اصول موضوعہ اور اوپر کے منتشر فقرے نہ صرف برکے کی تصویریت کی بنیاد ہیں، بلکہ میوم کی ارتبامیت اور کینٹ کی انتقادیت بھی انہی کی تہ میں پنہان ہے۔

ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء فرانس) نے اسی بنیاد کو زیادہ مستحکم اور حکیمانہ بنایا اس نے کہا کہ تمام ان چیزوں کو جنکا ہم کامل وضاحت اور صفائی کے ساتھ تصور نہیں کر سکتے۔ عدم یقین اور شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ صرف ان چیزوں کو مستبول کرنا چاہیے جنکا وجود ہمارے لیے بالکل نمایاں اور بدیہی ہے اس معیار پر صرف اپنا یعنی ایک سوچنے اور خیال کرنے والی ذات کا وجود قطعی اور یقینی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ ہم اجسام کے تمام خواص و صفات یعنی امتداد و شکل و غیرہ کے وجود خارجی پر شک کر سکتے ہیں۔ لیکن خود اپنے اندر کے خیال یا فکر کا انکار کسی طرح نہیں کر سکتے۔ کہ انکار یا شک بھی تو خیال کرنا ہی ہے۔ لہذا تمام ماوراء

فکر اشیا سے انکار کر دینے پر بھی نفس فکر کا وجود بدیہی اور ناقابل انکار ہے۔ بس کم از کم اتنا قطعی ہے کہ میں سوچتا ہوں لہذا میں ہوں یعنی میری ہستی سوچنے والی اور خیال کرنے والی ذات سے عبارت ہے۔ اور اسی کا نام ذہن نفس عقل و روح وغیرہ ہے جبکہ خود بالذات اور براہ راست واضح ترین علم حاصل ہے۔ لیکن آگے چلکر ایک دقیق منطقی مغالطہ سے دھوکا کھا کر ڈیکارٹ خود اپنے ہی اصول سے بھٹک گیا۔ جس طرح ہمارے لیے فکر و خیال کا تصور نہایت واضح اور صاف ہے اسی طرح امتداد و شکل کا تصور بھی بین طور پر موجود ہے۔ اور جس طرح فکر و خیال کسی فکر و خیال کرنے والے ذات کو مستلزم ہے۔ اسی طرح شکل و امتداد کسی شکل و تمتد چیز کو متضمن ہے، وہی مادہ ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روح کی طرح مادہ کا وجود بھی یقینی اور واضح ہے۔ روح کا بے فکر کے اور مادہ کا بے امتداد کے تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا فکر و امتداد علی الترتیب روح اور مادہ کے صفات ذاتی ہیں، جو باہم بالکل متضاد اور ایک دوسرے سے الگ مستقل بالذات موجود ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر دوسرا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے ذہن میں کمالیت اور نامحدودیت کے تصورات بین طور پر پائے جاتے ہیں جبکہ خود ہمارا ذہن نہیں خلق کر سکتا۔ کیونکہ وہ ناقص و محدود ہے۔ لہذا لازماً وہ کسی کامل اور نامحدود ذات کے آفریدہ ہیں اور وہی خدا ہے۔

لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۶۴۴ء انگلینڈ) نے تصویریت کے دو اہم اور بنیادی اصول نہایت صراحت کے ساتھ قبول کر لیے (۱) ذہن کے پاس فکر و استدلال کے لیے بجز خود کے ذاتی تصورات کے اور کوئی شے نہیں ہے۔ لہذا ہمارا علم تمام تر انہی تصورات ذہنی تک محدود ہے۔ یعنی ذہن کو خود اشیا سے خارجی کا براہ راست علم نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ

جانتا ہے۔ محض اپنے تصورات کی وساطت سے۔ (۲) کسی جوہر جسمی یا مادہ کا تصور ہمارے لیے اُسی قدر بعید الفہم ہے، جیسا کہ کسی جوہر روحی یا روح کا۔ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ امتداد شکل صلابت وغیرہ جنکا انسان کو حواس سے ادراک ہوتا ہے، یہ محض اعراض یا صفات ہیں، جو ایک غیر محسوس محل یا جوہر جسمی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہی محل اعراض یا جوہر جسمی مادہ ہے۔ لاک کے نزدیک اس قسم کے مادہ کا وجود قطعاً ناقابل فہم ہے اور موجودات خارجی محض اعراض یا صفات محسوسہ کا مجموعہ ہیں۔

ان صفات محسوسہ کی دو قسمیں ہیں اولیٰ اور ثانوی جنکو ہم علی الترتیب حقیقی اور غیر حقیقی کہیں گے۔ حقیقی سے مراد وہ صفات ہیں جو خارج مین ذہن سے باہر موجود ہیں۔ اور حواس پر ان کا اسی طرح انعکاس ہوتا ہے، جس طرح کسی شے کا آئینہ پر امتداد شکل، حرکت و سکون اور عدد اسی قسم کی تحت مین داخل ہیں۔ باقی رنگ روشنی ذائقہ آواز، بو، حرارت و برودت غیر حقیقی صفات ہیں یعنی انکا وجود ان کے احساس کرنے والے ذہن سے باہر نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی چکھنے، سونگھنے اور سننے والی ذات نہ موجود ہو تو ذائقہ، بو اور آواز کا بھی سرے سے کوئی وجود نہ ہوگا بالکل اُسی طرح جیسے دروغیہ درد محسوس کرنے والے کے نہیں پایا جاسکتا۔ اُن تصورات کی بنا پر جو آگ کا ایک انگارہ، برف کا مکڑا اور من ہمارے اندر پیدا کرتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انگارہ گرم درویشن، برف سفید اور سرد اور من سفید و شیرین ہے۔ ان صفات کی نسبت عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اجسام مین بعینہ اسی طرح موجود ہیں، جس طرح ہمارے ذہن مین اور ایک دوسرے کا ویسا ہی مکمل مشغے ہیں جیسا کہ آئینہ کا عکس اور اصل

شے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کہے، تو وہ بہت سے لوگوں کو نہایت ہی عجیب معلوم ہوگا۔ تاہم جو آدمی اسپر غور کرے گا کہ جو آگ ایک خاص فاصلہ پر رہ کر ہمارے اندر گرمی کا احساس پیدا کرتی ہے وہی قریب اگر تکلیف یا درد کا ایک بالکل مختلف احساس پیدا کرتی ہے۔ اسکو اپنے دلیں سوچنا چاہیے کہ یہ کہنے کے لیے اس کے پاس کیا حجت ہے کہ گرمی کا تصور جو آگ نے اس میں پیدا کیا ہے وہ تو واقعتاً آگ میں پایا جاتا ہے۔ اور تکلیف کا تصور جو اسی آگ نے اسی طریقہ سے پیدا کیا وہ خود اس آگ میں نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح کے تخلیلی دلائل کی مدد سے رنگ ذائقہ بو وغیرہ دوسرے صفات ثانوی کی نسبت بھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ان کا وجود ذہن سے الگ نہیں ہے لیکن چونکہ یہ مسئلہ نہ صرف لاکھ کے نزدیک بلکہ تقریباً تمام حکما (سائنٹسٹس) اور خود مادیین میں مسلم ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم بہ خوف طوالت یہاں اسکی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

یہ تسلیم کر چکنے کے بعد کہ ہم کو براہ راست صرف اپنے ذہنی تصورات کا علم ہے۔ اور یہ تصورات جن موجود فی الخارج صفات حسی سے ماخوذ ہیں وہ کسی غیر محسوس محل جوہری (مادہ) کے ساتھ نہیں قائم ہیں۔ نیز ہمارے محسوسات کا بڑا حصہ (صفات غیر حقیقی) ذہن سے باہر مطلقاً نہیں پایا جاتا۔ اور انکی حقیقت احساسات ذہنی سے زیادہ نہیں۔ اب تصویریت کی تکمیل کے لیے صرف اسکی ضرورت تھی کہ صفات غیر حقیقی کے حکم کو وسیع کر کے صفات حقیقی کو بھی انہی میں داخل کر دیا جائے۔

برکے نے یہی کیا۔ یعنی صفات حقیقی اور غیر حقیقی کی تفریق اٹھا دی۔ جب یہ پوری طرح معقن اور مسلم ہو چکا ہے کہ باصرہ، سامعہ، ذائقہ اور شامہ تمام آلات حس کے محسوسات

محض ذہنی ہیں، جبکہ احساس کرنے والے سے باہر کوئی وجود نہیں، تو پھر صرف ایک حاسہ لمس کے محسوسات کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ قطعی ہے کہ ہم کو صرف اپنے تصورات ذہنی کا علم ہے تو پھر یہ کہنا بالکل بے معنی ہے کہ رنگ مرہ۔ بو، اور آواز وغیرہ کے تصورات تو محض تصور کرنے والے ذہن کی مختلف کیفیات ہیں۔ لیکن امتداد شکل اور حرکت وغیرہ کے تصورات موجود فی الخارج چیزوں کا عکس یا مثنیٰ ہیں۔ اس کے علاوہ صفات اولیٰ کے تصورات کا صفات ثانوی کے تصورات سے الگ کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ امتداد کا بے کسی نہ کسی رنگ کے تصور کر سکے۔ لہذا جہاں رنگ کا وجود ہے وہیں امتداد کا بھی ہونا چاہیے۔ یعنی ذہن میں اس امر کو وضاحت کے ساتھ دلنشین کرانے کے لیے کہ صفات حقیقی اور غیر حقیقی یا اولیٰ اور ثانوی کی تفریق محض بے بنیاد ہے۔ ہم ایک مثال سے مدد لیتے ہیں۔ چسپ غور کرنے سے اصل حقیقت بالکل کھل جاتی ہے۔

ایک پیدائشی اندھے کی ہتھیلی پر زور سے ایک بیدار رو تو اُس کے ذہن میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوگی جسکو درد یا تکلیف کے احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس صرف اُس کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ نہ کہ بتدین ساتھی اس بیدار ہتھیلی کے تضادم سے ایک اور احساس بھی پیدا ہوگا جس کا نام آواز ہے۔ یہ آواز بھی محسوس کرنے والے ذہن ہی کی ایک کیفیت ہر کسی ایسی شے کا ٹٹنے یا مثال نہیں جو ذہن سے باہر بیدار ہتھیلی میں موجود ہے۔ اب تم اس بیدار ہتھیلی سے اس اندھے کی ہتھیلی پر رکھو تو درد اور آواز سے بالکل مختلف ایک حالت ذہن میں پیدا ہوگی، جسکو احساس لمس کہا جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ

احساسِ مس کی حالت احساس کرنے والے سے باہر بید میں پائی جاسکتی ہے۔ اب ذرا اسی بید کو اسکی تھیلی پر پھراؤ تو ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے جسکو وہ سرسراہٹ کہتا ہے، انصاف سے بتاؤ کہ کیا سرسراہٹ بھی اسی طرح محض ذہن کا ایک احساس نہیں جس طرح مس تھا۔ اسی سرسراہٹ کے حس ہی کا دوسرا نام تو حرکت ہے جسکو کوتاہ نظری سے صفات ثانویہ سے الگ کر کے خواہ مخواہ صفتِ ادلی کا لقب دیا گیا ہے۔ اس تجربہ کو ابھی ذرا اور وسیع کرو، اور اس اندھے سے کہو کہ بید کو اپنے ہاتھ سے ٹوٹے اور مٹھی میں دباوے۔ تو دو اور بالکل جدید کیفیات محسوس ہونگی۔ جنکا نام بید کی لمبائی (امتداد) اور گولائی (شکل) ہے۔ یہ دونوں بھی احساسِ مس ہی سے ماخوذ بلکہ اُسی کی مختلف صورتیں ہیں اسی مثال پر ذرا دھیان رکھنے سے یہ بالکل روشن ہو جاتا ہے کہ کم از کم لمسی امتداد، شکل، حرکت وغیرہ کی حقیقت تو درد، آواز، لمس وغیرہ کی طرح محض ذہنی حس ہے۔ اور ان کے وجود خارجی کا اذعان و اثبات سراسر تعصب اور مکابرہ ہے۔

اصلی دوسوہ جو اشیا کے وجود خارجی کے اعتقاد کو دل سے نہیں نکلنے دیتا، وہ امتداد، شکل، حرکت وغیرہ کی مرئیت یا حسِ بصری ہے نہ کہ حسِ لمسی۔ اس کھٹک کو کیا کیا جائے کہ ہم کو اپنے ذہن سے باہر مختلف مدت و قامت اور مختلف شکل و صورت کی چیزیں علانیہ مختلف فاصلوں پر حرکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسکا لازمی جواب تو یہ ہے کہ رنگ بھی ہمکو علانیہ ذہن سے باہر نظر آتا ہے، حالانکہ اُسکو کوئی بھی موجود فی الخارج نہیں سمجھتا لیکن تحقیقی جواب وہ ہے جسکے لیے برکلی نے مبادی پہلے جدید نظریہ رویت اکھا تھا، جس کا تفصیلاً اوپر ذکر گذر چکا ہے، اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے

کہ امتداد وغیرہ کو مرئی خیال کرنا محض التباس حواس ہے۔ اس سے بھی قطع نظر کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چیزوں کا مختلف طول و عرض و اشکال و حرکات کے ساتھ مختلف فاصلوں پر نظر آتا بھی ہے تو ایک احساس ہی، لمس کا نہ سہی بصر کا سہی اور احساس کا بغیر کسی احساس کرنے کے یا اس سے باہر موجود ماننا کیا ایک بین تناقض نہیں ہو رہا یہ خدشہ کہ امتداد حرکت شکل وغیرہ صفات یا اعراض ہیں جنکے قیام کے لیے کسی محل جوہری کا ہونا لازمی ہے، تو اولاً تو یہ لزوم فلاسفہ کا ایک بے دلیل فرضی دھوکوسلا ہے جسکی بنا اسی غلط نظریہ تجرید پر ہے ثانیاً یہ کہ خود ذہن ہی کو کیون نہ وہ محل جوہری قرار دیا جائے، جسکے ساتھ امتدادات وغیرہ کا احساس اسی طرح قائم ہے جس طرح غم، غصہ، لذت و الم وغیرہ کے احساسات۔ اس کے ماسوا، جس طرح عام خیال یہ ہے کہ نفس اور جسم دو بالکل مستقل اور الگ الگ قائم بالذات چیزیں ہیں اور جسم جب آلات جس پر عمل کرتا ہے تو نفس میں احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسری صورت یہ کہتی ہے کہ خود نفس ہی میں ایسی قوت موجود ہو کہ بلا کسی خارجی اعانت کے کامل ترتیب و انضباط کے ساتھ احساسات کو اپنے اندر خلق کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت کے فرض کرنے میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور اس صورت میں بھی تم خارجی محل جوہری کے وجود پر تمام وہ دلائل پیش کر سکتے تھے، جو اب کرتے ہو، حالانکہ اس وقت یہ دلیلین واقع کے قطعاً خلاف ہوتیں، غرض احساسات ذہنی کی تخلیق کے لیے خارج از ذہن جوہر جسبی یا صفات محسوسہ کے لیے محل کا وجود ماننا کسی ناقابل انکار استدلال پر نہیں مبنی ہے۔

اور برعکس کی تصویریت کا حاصل یہ ہے کہ تمام وہ چیزیں جنکا بالذات وبراہ راست حواس سے علم ہوتا ہے، وہ اسی طرح محض ہمارے تصورات ذہنی ہیں جس طرح حافظہ

اور تخیل کے آفریدہ احساسات ثانیہ مثلاً اس وقت جو کتاب تمہارے ہاتھ میں ہے، اسکی مخصوص شکل و صورت کو براہ راست اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہو، لیکن کسی دوسرے وقت جب یہ کتاب سامنے نہ ہو، تب بھی حافظہ یا تخیل کی مدد سے تم اسکی اُس مخصوص شکل و صورت کا اپنے ذہن میں تصور باندھ سکتے ہو۔ عام خیال کے مطابق کتاب کا پہلا تصور ایک خاص مادی اور ذہن سے باہر موجود فی الخارج کتاب کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسرا محض ذہنی ہے۔ مگر برعکس کے نزدیک دونوں محض ذہنی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا زیادہ واضح مرتب و منضبط ہوتا ہے اور ہمارے ارادہ کا تابع نہیں ہوتا یہ نہیں ہو سکتا، کہ ہم آنکھ کھولیں اور سامنے رکھی ہوئی کتاب کا دیکھنا یا نہ دیکھنا ہمارے اختیار کی بات ہو۔ بخلاف اسکے جب یہ کتاب سامنے نہ ہو تو حافظہ کی مدد سے اسکے احساس ثانی کا تصور پیدا کرنا، نہ کرنا ہمارے اختیار و ارادہ پر منحصر ہے۔ اسی فرق کی بنیاد پر ادول الذکر قسم کے تصورات کو اصلی اور حقیقی کہا جاتا ہے، اور ثانی الذکر کو مثالی اور غیر حقیقی فلسفہ طبعی (نیچرل فلاسفی) کا کام ان ہی تصورات اولیٰ کی ترتیب و انضباط کا مطالعہ ہے۔ اس مطالعہ اور پیہم تجربات سے ان تصورات کے اندر جن باہمی علائق کا ہمو علم حاصل ہوتا ہے، انہی کا نام قوانین فطرت (لائف نیچر) ہے، ان علائق میں سب سے اہم وہ علاقہ ہے جس کو علت و معلول کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جسکی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ہمو تجربہ یہ بتلا دیتا ہے کہ فلان فلان تصورات کے بعد فلان فلان دوسرے تصورات ذہن پر طاری ہوں گے مثلاً کھانا کھانے کے تصور کے بعد آسودگی یا کرب گرنگی کے زوال کا تصور، نیند کے بعد تازگی کا تصور، آگ کے بھری احساس یا تصور کے بعد گرمی کا لمسی احساس یا تصور، وغیرہ ذالک، خلاصہ یہ کہ عام طور پر حکما فلسفہ طبعی یا سائنس کا موضوع مادہ کے خواص

وانفال کی تحقیق سمجھتے ہیں لیکن حقیقت حکیات کے تمام شعبوں کا تعلق تصورات کے محض باہمی علائق سے ہے، جسکے مطالعہ کے لیے فلاسفہ کے محل جوہری کا ماننا مطلق ضروری نہیں۔

اس موقع پر برکھلے کی نسبت ایک عام غلط فہمی کو اچھی طرح رفع کر لینا چاہیے، جس پر اسکے مخالفین کی مضحکہ خیز یون کی بہت کچھ بنیاد ہے۔ انسان کے تمام معلومات کا اصلی سرچشمہ جیسا کہ لاک نے کہا ہے، صرف حواس ہیں اس لیے اگر انکی شہادت پر سے اعتماد اٹھالیا جائے، تو پھر ہمارے خزانہ علم میں صفر کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ دریا، پہاڑ، مکان درخت، حیوانات، خود اپنا جسم، غرض دنیا کی تمام چیزوں کا حواس اور صرف حواس سے علم ہوتا ہے، برکھلے کے اس کہنے سے کہ یہ تمام محض انسان کے تصورات ذہنی ہیں، یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ شہادت حواس کی تکذیب کرتا ہے، اور اس لیے دنیا کو حقیقی چیزوں کے وجود سے محروم کر کے ساری کائنات کو محض ایک خیالی طلسم خانہ بنا دینا چاہتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ تسخیر انگیز اور دیوانہ پن کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ لیکن دراصل یہ ان لوگوں کا اعتراض ہے، جنہوں نے آنکھیں کھول کر مبادی یا مکالمات ہائلس کے پڑھنے کی زحمت نہیں گوارا کی بلکہ سنی سنائی باتیں لے اڑے، ورنہ حقیقت جو الزام تم اس پر لگا رہے ہو، وہ اسلئے اس کا مجرم اپنے حریفوں کو قرار دیتا ہے، وہ صرف انہی چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کرتا ہے جسکا براہ راست آلات حس اور صرف آلات حس سے ادراک ہوتا ہے، البتہ عام فلاسفہ اور حکما حواس پر بھروسہ نہ کر کے محسوسات کے ماوراء ایک سراسر غیر محسوس اور نامعلوم شے کا وجود مانتے ہیں، جسکو مادہ، جوہر، محل، ہیولی، خدا جانے کن کن ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ع، خواب، مذیدہ، راہمہ، تبسیری، کند

اندھیر یہ ہے کہ اسی ندیدہ کا نام اصل اور حقیقت رکھتے ہیں اور برکے پر وہ بہتان رکھتے ہیں جو خود پر چھایا جاتا ہے۔ اب سنو کہ برکے کیا کہتا ہے ”وہ چیزیں جنکو میں آنکھوں سے دیکھتا اور ماتھوں سے چھوتا ہوں، وہ موجود ہیں، حقیقتاً موجود ہیں“ ان کے وجود میں مجکو ذرہ بھر بھی شبہ نہیں جس چیز کا میں منکر ہوں، وہ صرف وہ ہے جسکو فلسفی ماوہ یا جوہر جی کہتے ہیں، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم چیزوں سے واقفیت یا وجود کو چھینے لیتے ہیں تو وہ جو کچھ کہا گیا ہے مطلق نہیں سمجھا جائے۔“

اگرچہ ثنویہ کی طرح برکے کائنات کی تعمیر کے لیے ماوہ اور روح دو مختلف الما ہیۃ عنما ضروری نہیں خیال کرتا اور اس حیثیت سے وہ وحدیہ کے زمرہ میں داخل ہے۔ لیکن ایک دوسری حیثیت سے، وہ ثنویہ نہیں بلکہ تشلیشی ہے، یعنی عدداً وہ تین چیزیں الگ الگ مانتا ہے۔ تصورات حسی، نفس، جو ان تصورات کا ادراک کرتا ہے، اور وہ روح برتر، جو ان تصورات کو نفس پر قمرم یا طاری کرتی ہے۔ عرف عام میں انہی تینوں کو بالترتیب نیچر (موجودات حسی)، ذہن انسانی، اور خدا کہا جاتا ہے۔ یہی تشلیث برکے کے نظام فلسفہ کا سب سے کمزور اور ناقابلِ حمایت حصہ ہے۔ یہ ٹھوکر محض اس نے اپنے مذہبی غلو اور جوش کی بدولت کھائی ہے۔

بہ ظاہر یہ ایک بالکل بیسی بات معلوم ہوتی ہے کہ جب تصورات و ادراکات کا وجود ناقابلِ انکار ہے تو پھر لامحالہ کوئی تصور و ادراک کرنے والی ذات بھی ہونا چاہیے، وہی ذہن، نفس یا انسان ہے، یہ بہ لحاظ اپنی حقیقت کے اسی طرح ایک جوہر روحی یا غیر مادی ہستی ہے جس طرح خدا۔ فرق یہ ہے کہ یہ مخلوق ہے اور خدا خالق۔ لیکن ایک بار مخلوق

ہونے کے بعد اب یہ ہمیشہ کے لیے ناقابلِ فنا ہے۔ یہ نفس چونکہ تصورات کا حامل اور ان پر عامل و متصرف ہے، ایسے گویا اسکی حقیقت میں فاعلیت داخل ہے باقی تصورات تو محض منفعل ہیں۔ لہذا خود اپنے نفس کا تصور نہیں ہو سکتا، ورنہ پھر وہ بھی بجائے فاعل کے منفعل اور تصور کرنیوالی ذات کی جگہ خویک تصور بن جائیگا۔ اس بنا پر اس نفسِ مدک کا علم ہمکو اپنے تصورات سے محض استنباطاً حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی استنباطی علم کا نام برکے نے درک (نوٹن) رکھا ہے۔ اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا، ادراکات اور تصورات سے معرکہ کر لینے کے بعد ہستی درک کے ہم کچھ بھی معنی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا افکار و ادراکات کے تسلسل کے ماسوا نفس کی کوئی اور ماہیت ثابت کیجا سکتی ہے؟ اور کیا تسلسل افکار و احساسات سے مجرد کر کے الگ ایک جوہر روحی کا وجود قبول کرنا، اس سے کچھ بھی وسیع تر ہے، جتنا، صفات محسوسہ سے مجرد کر کے جوہر جسمی (مادہ) کا ماننا؟ کیا فکر و ادراکات مسلوب نفس، مادہ کی طرح ایک مہل اور بے مفہوم لفظ نہیں ہے؟ ان تمام سوالات کو جواب میں ہمکو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہر کلمہ نادانستہ تجرید کے اسی گناہِ عظیم کا مرتکب ہوا ہے جس سے احتراز کو اس نے اپنے فلسفہ کا سنگ اساس قرار دیا تھا۔ اور جسکو وہ اپنے تمام پیشرو فلاسفہ کی گمراہی کا متنازع و حید یقین کرتا ہے۔

روح برتری خدا کے وجود کا استدلال اس سے بھی کم مایہ ہے جو تصورات براہ راست حواس کی وساطت سے حاصل ہوتے ہیں چونکہ انکا پیدا اور فنا کرنا ہمارے قدرت و اختیار سے باہر ہے لہذا انکی آفرینش کے لیے کوئی اور صاحب ارادہ اور انسانی اذنان سے وسیع القدرت ذات ہونی چاہیے اور چونکہ یہ تصورات حسی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اور مقررہ اصول کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں، ایسے وہ ذاتِ حکیم بھی ہے، وگرنہ الگ

واحد، غیر منقسم، فعال، انلی، ابدی وغیرہ تمام اُن صفات کی جامع ہے جو ایک کامل ترین
 ہستی میں پائی جانی چاہیں، اولاً تو یہ قولِ ل کے یہ کہنا صحیح نہیں کہ تصورات حسی کے
 علاوہ باقی تمام تصورات انسان کے ارادہ کے تابع ہیں سیکڑوں خیالات ہمارے ذہن
 میں بلا ہماری خواہش اور ارادے کے پیدا ہوتے رہتے ہیں، بلکہ اگر ہم انکو دور کرنا چاہتے ہیں
 تو نہیں کر سکتے، لہذا جب انکی آفرینش کے لیے کسی برتر روح کی احتیاج نہیں، تو تصورات
 حسی کی کیا تخصیص ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر تصورات کی خلقت کے لیے کسی سبب کا ہونا
 ناگزیر ہے، تو پھر ہم اُسی مادہ کو کیون نہ مان لیں، کیونکہ جس طرح صفات محسوسہ سے مفصل کر کے
 مادہ کا وجود ہمارے لیے ناقابلِ فہم و تصور ہو جاتا ہے، اسی طرح خدا کو جن صفات سے
 متصف یا منزہ بتلایا جاتا ہے، مثلاً ناقابلِ احساس، غیر محدود، غیر مخلوق، ہر جامو جو د،
 وغیرہ انکی حامل ذات کا بھی ہماری سمجھ میں آنا قطعاً ناممکن ہے، رہی یہ بات کہ نسبت
 کسی بے حس و ادراک ہستی کے ایک صاحبِ قدرت و ذی ارادہ ہستی کو خالقِ تصورات
 ماننا زیادہ قویٰ قیاس ہے، ایک غیر ثابت اور بحث طلب ہے مسئلہ ہے، البتہ اس قیاس
 کی صحت کے نفس امکان یا امکانِ مرجح سے بجز جاہل ملاحظہ کے کوئی فیہ آدوی نکال نہیں کر سکتا
 ایک دوسری دلیل جو برکھے نے وجودِ خدا پر قائم کی ہے وہ دراصل ان بعض اعتراضات
 سے بچاؤ کے لیے ہے، جو اسکے اصول کو قبول کرنے سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً (۱) جب
 تمام محسوسات انسان کے محض ذہنی تصورات تھیں تو پھر ڈرائنگ روم میں جس وقت
 کوئی آدمی (تصور کرنے والا ذہن) نہیں ہے، تو وہاں فرنیچر کا بھی مطلقاً کوئی وجود نہیں
 ہے، اور جیسے ہی کوئی شخص کمرہ میں داخل ہوتا ہے تمام چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں، دوسرے
 لفظوں میں یوں کہو کہ تمام چیزیں ہر وقت پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں کسی شے کا کوئی

مستقل اور دائمی وجود نہیں (۲) جب کسی شے کا ذہن سے باہر وجود نہیں اور مختلف وجود کے تصورات کسی ایک وجود خارجی کا عکس نہیں ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بعینہ کسی ایک ہی چیز کو دو آدمی نہیں جانتے جس آفتاب کو زید دیکھ رہا ہے، بعینہ اسی کو عمر نہیں دیکھ رہا ہے، کیونکہ اسکی مستقل بالذات کوئی ہوسکتا ہے ہی نہیں یہ اور بات ہے کہ دونوں کے تصورات اس قدر باہم مشابہ اور مثال ہوں کہ کوئی فرق نہ کیا جاسکے، لیکن وہ ایک ہی شے کے تصورات نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کے اعتراضات سے بچنے کے لیے برہکے نے ایک برتر روح یا ذہن (خدا) کی آڑ میں پناہ لی۔ اگر تمام انسانی اذہان فنا بھی ہو جائیں تب بھی تمام چیزیں خدا کے ذہن میں موجود ہیں اور ہر شے کا ہر وقت پیدا اور فنا ہونا نہیں لازم آتا، اسی طرح زید و عمر دونوں کے تصورات خدا کے تصور واحد کا پرتو ہیں جسکی ہوسکتا ہے کہ کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوتی لیکن ہمارے نزدیک فلسفہ کے نقطہ نظر سے، ان اعتراضات ہی کی سرسے سے کوئی وقت نہیں۔ عام خیال کی روست البتہ یہ ایک بہت عجیب اور نہایت ہی مستبعد بات معلوم ہوتی ہے کہ چیزیں ہر لمحہ پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں، یا زید و عمر کے ذہن میں آفتاب کے الگ الگ جواہرات دن کو پیدا ہوتے ہیں، وہ کسی تیسرے بعینہ ایک مستقل اور قائم بالذات آفتاب سے ماخوذ نہیں ہیں لیکن فلسفہ تعصبات عامہ کا پابند نہیں ہے۔ وہ اسکی مطلق پرواہ نہیں کرتا کہ اسکی تحقیقات سے دنیا کے عام عقائد اور سلمات کو کیا صدمہ پہنچے گا۔ اسکی خرد گیری سے حکمت و ریاضی کے مبادی کو بھی جو اپنی جگہ بر قطعی خیال کیے جاتے ہیں پناہ نہیں حاصل۔ لہذا وہ نہایت دلیری سے یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اچھا اگر چیزیں ہر آن پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہیں تو یہ ہنرے دو یا زید جس آفتاب

کو دیکھ رہا ہے۔ عمر بعینہ اُسی کو نہیں دیکھتا تو نہ دیکھے، اس میں قباحت اور عقلی استحالہ کیا ہے؟ باقی اگر عام مقدمات کا لحاظ کیا جائے تو پھر فلسفہ کو ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جانا چاہیے، اور برکے کو یہ کہنے کی ہرگز ہمت نہ کرنی چاہیے تھی کہ اشیاء کا ذہن سے باہر مطلق کوئی وجود نہیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ شاید ہی کوئی اور چیز مقدمات عامہ کو صدمہ پہنچا سکتی ہو۔ اصل یہ ہے کہ برکے نے جس فلسفیانہ جرأت سے ہزار سال کے پردہ نصیبات کو چاک کر دیا تھا، اس کو وہ آخر تک نہ نباہ سکا۔ اور جس راستہ کا رہنما تھا، خود اس سے بھٹک گیا، مگر کیا کیجیے کہ یہ خود فراموشی وہ بشری کمزوری ہے، جس سے بچنے کا کوئی انسان انسان رہ کر دعویٰ نہیں کر سکتا۔

برکے نے جا بجا اس بات پر نہایت وثوق آمیز اور مدعیانہ اصرار کیا ہے، کہ اگر اس کا فلسفہ تصوریّت قبول کر لیا جائے، اور موجودات خارجی کے اعتقاد کو ذہن سے نکال دیا جائے تو (الف) مباحث الہیات کی بیسیوں گتھیاں، جو ہزار سال سے لائیل علی آتی ہیں از خود وا ہو جاتی ہیں، اور (ب) تشکیک یا ارتیاسیت کا ہمیشہ کے لیے قدم اکھڑ جاتا ہے۔ اگر دنیا کا کوئی فلسفہ بھی ایسے اہم نتائج کا ذمہ دار اور حامل ہو، تو اسکی عظمت سے ذرہ بھر بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم کو شک ہے کہ تصوریّت کا اصول اس معیار پر پورا اترتا ہے، رہا خود برکے کا اتنا غیر متزلزل ادعا، تو وہ اس جوش اور انہماک کا عین اقتضا تھا، جو ہر مکشف اعظم کو اپنے اکتشاف و اجتہاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

بلاشبہ موجودات خارجی یا مادہ سے دست بردار ہو جانے کے بعد ان بحثوں کا قطعی استیصال ہو جاتا ہے کہ مادہ کی کیا حقیقت ہے؟ اس میں حیات اور فکر ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ وہ ذہن پر کیونکر تصرف و عمل کرتا ہے؟ قدیم ہے یا حادث؟ اسکی قسمت پذیری تناہی یا غیر تناہی؟ وغیر ذالک۔ لیکن کیا انکے مقابل میں نفس یا

روح کے بارے میں اتنے ہی لانیل سوالات نہیں کیے جاسکتے؟ روح کیا ہے؟ فکر و حیات اس کے افعال ہیں یا ماہیت؟ وہ ازلی ہے یا مخلوق؟ فانی ہے یا ناقابل فنا؟ انسانی روح اور روح برتر (خدا) میں کیا علاقہ ہے؟ خدا نفوس انسانہ پر کیونکر تصرف و عامل ہے؟ خود خدا کی ہستی سے متعلق اس سے بھی بڑھ کر محیر العقول پیچیدگیوں رونما ہوتی ہیں۔ اسکی ازلیت، نامحدودیت، عالم الغیبی، وغیرہ سیکڑوں صفات میں سے کسی ایک کا بھی ہماری سمجھ میں آنا قطعاً ناممکن ہے، برکھے نے نفس انسانی اور خدا کی نسبت ان گہروں کے کھولنے کی کوشش کی ہے، اور مبادی کا آخری حصہ (بندہ ۸۵-۱۵۶) کہنا چاہیے کہ کل کا کل انہی چیزوں کی نذر ہو گیا ہے۔ لیکن تم خود اس کو پڑھ کر انصاف سے بتلاؤ کہ اسکی بساط کچھ بھی مدہم یا ہمارے متکلمین کے اس طلسم الفاظ سے زیادہ ہے جسکی برکھے نے مقدمہ مبادی اور دیگر تصانیف میں جا بجا ہنسی اڑائی ہے۔

اب رہا تشکیک و ارتیابیت کے سد باب کا دعویٰ، تو اس میں کلام نہیں کہ جہاں تک خود برکھے کے ذاتی اذعان کا تعلق ہے، تاریخ فلسفہ میں شاید ہی کوئی فرد اس سے زیادہ ارتیابیت کا دشمن ملے۔ لیکن اسکو خبر نہ تھی کہ نادانستہ وہ خود اپنے حریف کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے اور سنی اسکی تصویریت سے زیادہ فلسفہ کا کوئی مذہب تشکیک کی پشت پناہی نہیں کر سکتا۔ بہ ظاہر تو یہ بات بالکل بدیہی معلوم ہوتی ہے کہ جب ہم اپنے تصورات ذہنی یا احساسات کے ماوراء کسی شے کے قائل ہی نہیں تو لا محالہ اس تشکیک کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی کہ ہمارے احساسات موجودات خارجی (مادہ) کے کسی حد تک مطابق اور نمایندہ ہیں یا سرے سے کچھ بھی مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں جب محسوسات کی کل حقیقت ہمارا احساس ذہنی ہی ہے، اور اپنے احساسات ذہنی

کے وجود میں شبہ ناممکن ہے کہ اُن سے زیادہ اور کیا چیز عیان تر ہو سکتی ہے۔ تو پھر اب
اشتباہ و تذبذب کا محل ہی کیا ہے؟

لیکن اصل یہ ہے کہ اولاً تو تشکیک کے یہی معنی نہایت محدود ہیں، اور دشمن کے کسی
ایک قلعہ کی تخریب سے اُسکی شکست کا کیونکر یقین و اعلان کیا جاسکتا ہے۔ مان لیا کہ
محسوسات کا کوئی خارجی محل (مادہ) نہیں ہے، اسلئے اسکے علم و عدم علم کی بحث لایعنی
ہے۔ لیکن یہ غلطی اب بھی باقی رہ جاتی ہے کہ احساسات یا تصورات کیونکر پیدا ہوتے
ہیں، خود نفسِ مدرک ہی ان کا خالق ہے یا کوئی اور ذات؟ نفسِ مدرک یا اُس
ذاتِ آخر کی کیا ماہیت ہے؟ تخلیقِ تصورات کی کیا غایت ہے؟ یہ اور اس قسم کے
سیکڑوں و سو سوں میں سے کیا ایک کا بھی فیصلہ کن جواب دیا جاسکتا ہے؟ یا ایک لمحہ
کے لیے بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک بات بھی ہمارے لیے
اُس طرح غیر مشتبہ اور بدیہی ہے، جس طرح اپنے تصورات ذہنی کا نفس وجود و مگر ان سب
باتوں سے قطع نظر کر کے ہم دریافت کرتے ہیں کہ بے تھاہ موجِ سمندر، آتشِ نشان پہاڑ
افریقہ کا صحرا، اعظم، ہمالیہ کی ہزاروں فٹ بلند چوٹیاں، آفتاب کا ماہیت ناک جرم
ناری، سائے کے درخت، مکانات، پچلتے پھرتے جانور اور آدمی، خواہنا جسم کیا ان میں
سے کسی ایک شے کے بھی وجود خارجی کی نسبت شک یا وہم شک بھی ممکن معلوم ہوتا تھا۔ کیا وہ
شخص قطعی فائر العقل نہ خیال کیا جاتا، جو ان کو اپنے یا دوسرے کے محض ذہنی تصورات قرار
دیتا، لیکن تنہ دیکھ لیا کہ ہر کھلے نے اُسی قسم کے استدلالات اور اسی قسم کی منطق سے
جس سے ان چیزوں کا ناممکن انشک و حود خارجی ثابت کیا جاتا تھا، اس طرح انکو محض ذہنی
کرد کھلایا کہ ہر کو خود اپنے وجود میں شک ہونے لگا، یہ ظاہر ہے کہ ہر کھلے کے دلائلِ دنیا کی

اعتقاد کو نہیں پلٹ سکے لیکن کیا ایک سوچنے والے دماغ میں ان سے طرح طرح کے شکوک اور دوسو سے نہیں پیدا ہو گئے؟ تصویریت کا نظریہ بے شبہ اٹل نہیں ہے، لیکن کیا اسکی صحت کا کم از کم امکان و احتمال نہیں پیدا ہو گیا، اس نظریہ کی شک آفرین قوت ہی تھی جسے پرسیپٹوئل کہ جو کوئی فلسفی نہ تھا، یہ اعتراف کرنے پر بے بس کر دیا، کہ ”آپ کا (برکے) خیال بھی اسی قدر اغلب ہے، جتنا وہ خیال (اشیا کا وجود خارجی) جبکی آپ تردید کرتے ہیں۔ دونوں برابر درجہ کی دشواریوں سے دوچار ہیں“ اس موقع پر ہم اتنا بے کسے نہیں رہ سکتے کہ برکے کے فلسفہ کی تائید و تردید میں سیکڑوں اور ہزاروں صفحے لکھے گئے ہیں لیکن پرسیپٹوئل کے اس ایک جملہ میں فلسفہ تصویریت کی جتنی صحیح اور جامع تنقید موجود ہے، دوسروں کے دفتر میں بھی نہیں سچ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک سلیم الطبع عامی آدمی کا ذہن جس نکتہ پر پہنچ جاتا ہے فلسفی کا کچھ رد و انکال پسند دماغ اسکو نہیں پاسکتا۔

غرض یہ ہے کہ برکے کی تصویریت ازعان بخشی کی طاقت تو نہیں رکھتی۔ لیکن دونوں میں شک انداز می کے لیے وہ کافی سے زیادہ قوی ہے۔ اور یہ دیکھ کر کہ جس چیز کو (اشیا کا وجود خارجی) کہنا چاہیے کہ ایک بدیسی اور اٹل حقیقت یقین کیا جاتا تھا۔ اسکو محض ایک ہوائی قلعہ اور بے بنیاد شے ثابت کیا جاسکتا ہے، ایک غور و فکر کرنے والے آدمی کا اعتماد اپنے علم و استدلال پر سے قطعاً اٹھ جاتا ہو اور وہ ناچار کم از کم عالم فکر میں تشکیک مطلق میں گرفتار ہو جاتا ہے، برکے نے جس حربہ کو دشمن کا قاتل خیال کیا تھا وہ دراصل اسکی حمایت کا سب سے زبردست آلہ ہو۔ اصل یہ کہ علم کی رسائی لاعلمی سے آگے نہیں۔ اور فلسفہ کا منہما بس یہی ارتیابیت و لاعلمی ہے، کہ ”معلوم شد کہ سچ معلوم نیست“

عام تبصرہ

ع، اند کے باز گویم از بسیار

انگلستان کے مشہور شاعر اور برکے کے معاصر الکزنڈر پوپ نے لکھا ہے کہ ”آسمان کے تلے کوئی فضیلت نہیں جو برکے میں نہ ہو“ یہ خالی شاعری نہیں ہے۔ پوپ کے شعرا ایران کے بھاٹ نہیں ہوتے، کہ شیطان کو فرشتہ یا آدمی کو خدا کہیں، انکا مبالغہ پس لطف شعری کی حد تک ہوتا ہے، پھر پوپ تو ان بدنام ہجو گو اور حاسد شعرا میں ہے جسکی زبان سے بہت ہی کم کسی حریف عصر کی تعریف نکلی ہے تم خود برکے کی سوانح پڑھ کر تصفیہ کر سکتے ہو کہ فضل و کمال کی ایسی بے داغ تصویرین قدرت کا ماتھہ ہر روز نہیں کھینچا کر تاع قرنہا باید کہ تا ابد، اس کا دامن ذہنی کمالات کے ساتھ حسن سیرت اور حسن عمل کے موتیوں سے یکساں طور پر لبریز ہے۔

عام عادات و اخلاق اتنے دلکش اور بات چیت اس قدر عالمانہ ہوتی تھی کہ اپنے وقت کے زبردست عالم بشپ ایٹربری کی زبان سے اولین ملاقات میں یہ الفاظ نکلے کہ ”اتنی عقل، اتنا علم، اتنی معصومیت، اتنی تواضع، جب تک میں نے اس شریف زاؤ کو نہیں دیکھا تھا صرف فرشتوں کا حصہ خیال کرتا تھا“ خود داری کا یہ عالم کہ اپنی ذات خاص کے لیے زندگی بھر کسی کا منت کش نہ ہوا۔ آج بشپ جیسے جلیل القدر منصب کے

۱۔ اس کا سب سے مشہور کارنامہ ہومر کا ترجمہ ہے، ہجو گوئی، مناصرین کے ساتھ علمی حسد اور کینہ داری کے لیے بدنام ہے۔

حصول کے لیے بھی باوجود احباب کے شدید اصرار کے، کسی کے سامنے ایک جنبش لب تک
 روانہ رکھی۔ ابنائے جنس کی خدمت کے دلولہ اور قناعت و ایثار کا یہ حال کہ ۱۱-۱۲ سو سال
 پوند کی ڈنیری کو ٹھکرا کر وطن سے ہزار دن میل کے فاصلہ پر نئی دنیا کا ایک خاموش
 گوشہ (جزیرہ رہوڈ) جا بسایا۔ اہل وطن کی فلاح و بہبود کے لیے تو آخری عمر کے پورے
 ۱۶-۱۸ برس وقف کر دیے۔ عیلت کی یہ انتہا کہ فلسفی ہو کر سوت کا تنے کا کارخانہ چلاتا تھا۔
 بیکاروں کو مشغول بنانے اور غربا کو روزی سے لگانے کے لیے سن کی کاشت شروع
 کی سو دیشی کی ہمت افزائی کے لیے آئرلینڈ کے جلاہون کا بنا ہوا بدترین کپڑا استعمال
 کرتا تھا۔ تقدس اور عبودیت کا یہ رنگ کہ بارہ بارہ بچے شب کو اٹھ کر عبادت کرتا تھا
 گفتگو میں اس درجہ محتاط کہ زبان سے کبھی کوئی بجا کلمہ نہیں سنا گیا۔ منزلی زندگی میں وہ
 بہترین شوہر، مربی بھائی، فرض شناس باپ اور حق شناس آقا تھا، چھوٹے بھائیوں کی
 تعلیم کا پورا کفیل رہا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں مزدور معلمین پر بھروسہ نہیں رکھتا تھا۔ انکی
 ایک ایک حرکت اور ادا کی خود نگرانی کرتا تھا۔ آفاقیانہ حق شناسی یہ کہ بی بی کی لڑکی کی نرس
 کی پرورش کے لیے سالانہ باندھ دیا تھا تو بھلا خود اپنے ملازمین سے کیا کیا حسن سلوک
 نہ کرتا ہوگا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ نفاست پسند زندگی اور دنیا کی نعمتوں سے متع کو نہ
 فلسفیت کے منافی جانتا تھا اور نہ مذہب کا گناہ۔ اسکے صبطل میں چھ چھ گھوڑے بندھے
 تھے، اس کا مکان آرائش کی چیزوں سے سجا تھا، وہ اچھا اور ہوشیار بادچی رکھتا تھا۔
 اب اسکی ذہنی زندگی کا صفحہ الٹ کر پڑھو تو اسٹورٹ مل نے لکھا ہے کہ برکلے
 کے عظیم الشان انکشافات نے "اسکے پیٹ اور بعد کے علم النفس اور مابعد الطبعیات میں سیدہ

فرق و اختلاف پیدا کر دیا ہے، جتنا نئی اور پرانی تاریخ یا قدیم و جدید طبیعیات میں ہر چھ مہینے
 (مبادی انبیات - جز ۲ صفحہ ۷۷) جو تصورات کلیہ کے منکر اور فلسفہ تصوریت کے مانی
 کا سجد دشمن ہے، اسکو بھی اتنا اعتراف کرنا پڑا کہ برکھ کا نظریہ رویت انبیات کی غیر متفقہ گئی ہے
 فکر و اجتہاد اس کے تمام علمی کارناموں کی روح ہے۔ تقلید سے زیادہ وہ کسی پیر کو
 تنگ نہیں خیال کرتا۔ اپنے دائرہ سے باہر بھی جس شے کو ہاتھ لگا دیا، اس میں وہ شکستہ
 زبان سے نکلے جو آگے چل کر فن کے ابواب بنگئے۔ علم الاقتصاد میں متفسر کے اشارات
 نے آدم اسمتھ کی پیش روی کی ہے، علم الاخلاق میں افادیت کے اُس دقیق اصول
 پر نظر پھنچی، جو آج اخلاقیات کا سب سے مقبول نظریہ ہے۔ نظریہ تعلیل میں ہیوم کا رہنمائی
 اُس کے مکالمات انگریزی کے لٹریچر انبیات کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ
 انگلستان کا فلاطون اور سرو ہے، اوست نظر کا یہ نقشہ کہ ضروریاتِ ان۔ قدیم و جدید فلاسفہ
 اور حکما (علمائے سانس) میں ایک ایک سے باخبر ہے اور اچھی طرح باخبر ہے، ہمہ گیری
 کی یہ کیفیت کہ اس کے عہد تک حکلیات کے مختلف شعبوں نباتات، حیوانات، تشریح، کیمیا،
 عضویات، میکاتک، علم المرایا، اور طبیعیات، وغیرہ میں جو کچھ تحقیقات ہو چکی تھیں سب پر عالماً
 اطلاع رکھتا تھا۔ ریاضیات میں تو خداے ریاضی نیوٹن کے بعض مسائل کی سطح
 دھیان اڑائیں کہ علمائے ریاضی سے مدتوں جواب نہ بن آیا۔ اکی ہمہ گیری صرف عقلیات
 تک محدود نہ تھی، وہ یورپ بھر کی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ پر اس قدر حامی تھا کہ اس زمانہ
 میں اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ واقفیت سطحی نہ تھی بلکہ اعداد و شمار کا حافظ تھا اگر فلسفہ
 میں فنون لطیفہ نے اُسی کے گھر سے رواج پایا۔ غرض صاحب نظر کے لیے اسکی زندگی کا ہر رخ
 دلکش اور سبق آموز ہے۔ ع رمز شناس کہ ہر نکتہ ادا سے دارو۔

ضمیمہ تصوّراتِ کلیہ

”مبادی علم انسانی“ کے مباحث کی تلخیص کے وقت ”تصوّراتِ کلیہ“ کے ”مقدمہ“ سے صرف اس بنا پر نہیں تعرض کیا گیا تھا کہ اس مختصر ایک مستقل مضمون لکھا جا چکا ہے (دیکھو کتاب ہذا صفحہ ۷۲)

لیکن چونکہ یہ بحث بقول میوم کے اس قدر اہم ہے کہ ”میں اس کو ۴۷ جدید کے سب سے عظیم الشان اور وسیع اکتشافات میں سمجھتا ہوں“ (کتاب فطرت انسانی، حصہ اول فصل) اس لیے بطور ضمیمہ کے اس مضمون کا داخل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سقراط کا قول ہے کہ کسی چیز کا صحیح علم بلا تصور کلی کی جانب رجوع کیے ناممکن ہے، ارسطو تصوّراتِ کلیہ یا ذاتیات اشیاء کی جستجو ہی کو سقراط کا واحد فلسفیانہ کارنامہ خیال کرتا ہے (الہیات ارسطو۔ ذکر سقراط) خصوصاً الہیات کی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑہ قریباً ڈھائی ہزار سال سے یہی مجرّدات یا کلیات ہیں، ریاضیات کے حدود و اصول سرایا مجرّدات ہیں، علوم طبیعیہ جنکی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اہکا قدم بھی بے وضع کلیات کے نہیں اٹھتا، ہماری روزمرہ کی گفتگو یا تحریر میں دس محلے بھی ایسے شکل سے مل سکیں گے جو الفاظ کلی کے استعمال سے خالی ہوں۔ کیا ایک ایسی شے کے وجود واقعی سے، جس کا استیلا اور جسکی احتیاج اسقدر عالمگیر ہو، انکار یا شبہ انکار بھی ممکن ہے ۳۰ اپریل ۱۹۰۷ء کے روزنامہ میمن قارئین کی توقع کے خلاف اس سوال کا جواب یہ پاتا ہوں: ”مفہیم کی تقسیم کلی اور جزئی صحیح نہیں معلوم ہوتی، یا تمام مفہیم کلی ہیں یا تمام جزئی صورت

ثانی قابل قبول ہے۔ ”پھر ہر اگست سٹوڈنٹس میں یہ ملتا ہے ”زبان میں الفاظ کلی موجود ہیں ان کا استعمال اس قدر کثیر اور ناقابلِ اجتناب ہے، کہ دھوکا ہونے لگتا ہے، کہ ذہن میں کوئی واقعی مصداق کلی بھی موجود ہے، ورنہ دراصل ذہن مصداق کلی کے تصور سے بالکل عاجز ہے، اسی بنا پر جب کسی حکم کا محکوم علیہ کلی ہو تو ذہن کے سامنے کوئی نہ کوئی جزئی آجاتا ہے اور بر بنائے تمثیل وہ تمام افراد پر مجملاً حکم لگا دیتا ہے۔ ”برکھلے نے اپنی کتاب ”مبادی علم انسانی“ پر جو مقدمہ لکھا ہے اور اس پر نظر ڈری، وہ تمام تر اسی بحث سے متعلق ہے۔ فلسفہ کی نشاۃِ جدیدہ کے اس بلند پایہ فرزند کے ساتھ تو اردو ذہنی نے ہمت بندھائی، کہ اس موضوع پر پنجابہ افکار کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کر دے اور خود اس مقدمہ کو بھی اردو میں ہدیہ ناظرین کر دے جس کو اس مسئلہ پر خاتم المباحث کہنا چاہیے۔

کلیات کا مسئلہ علی العموم فن منطق کا ایک بڑا خیال کیا جاتا ہے، جو ایک حد تک بجا بھی ہے، لیکن مجردات یا کلیات کی ماہیت، ان کا منشا اور انکی حقیقت ذہنی کو روشنی میں لانے کے لیے دراصل نفسیاتی حجت سے فکر و تامل کرنا چاہیے۔ یہاں تک پہنچ کر معاً خیال آیا کہ اس بحث پر نفسیات کے امام اعظم ولیم جیمس کا فیصلہ معلوم کیے بغیر قلم کو آگے بڑھانا، اسکی پایہ ناشناسی سے زیادہ اپنی کم نظری کا ثبوت ہوگا، نہایت ذوق و شوق سے اسکی مشہور کتاب ”مبادی نفسیات“ کا گیارہواں باب جو اسی بحث سے متعلق ہے کھولا۔ اور حسن گمان کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، کہ بس اب تھوڑی دیر میں ساری گریہیں کھلی جاتی ہیں لیکن حیرت و استعجاب کی کوئی انتہاء نہیں جب یہ معلوم ہوا کہ برکھلے کی تیز مشعل کے سامنے موجود ہونے پر بھی اسکی مجتہدانہ نگاہ دو ہزار برس کے پردہ کا ظلمت کو نہ چیر سکی اور بالآخر اجتہاد نے روایت سے شکست کھائی، استعجاب سے زیادہ تاسف انگیز یہ بات ہے کہ عالم نفسیات کی حیثیت میں بجائے اس کے کہ یہ اہم مسئلہ کی ذہنی تحلیل و تشریح کرتا۔ اپنی عام عادت کے خلاف مل وغیرہ کے چند اقتباسات کی مناظرانہ اور انشا پر دازانہ

تفتید پر تفاعت کی ہے۔ مجبوراً اب ہم رہنمائے وحید شپ برکے کا ماتھ پکڑ کر چلتے ہیں۔ سب سے پہلے سہولت فہم کے لیے مجردات و کلیات کی توضیح ضروری ہے اور امید ہے کہ اسی توضیح کی روشنی میں ارباب تامل کی نگاہیں جاوہ استقامت کو پالیں گی۔

زبان میں دو مختلف قسم کے لفظ موجود ہیں۔ ایک مثلاً چنگیز خان۔ پولین۔ ہومر، فردوسی، ابن سینا وغیرہ، دوسرا انسان۔ اسی طرح لندن۔ پیرس۔ اسکندریہ۔ کلکتہ وغیرہ اور شہر۔ آدن۔ عربیہ۔ ٹوینا وغیرہ (خاص خاص جہازوں کے نام) اور جہاز۔ مبادی نفسیات، گلستان، شوالجم وغیرہ اور کتاب یا گلد ہال، قصر حرم، تاج محل وغیرہ اور عمارت، ان میں پہلی قسم کے الفاظ جزئی کے جلتے ہیں اور انسان شہر کتاب عمارت یا ان کے مثل الفاظ کا نام کلیات ہے۔ ایک دوسری صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ سفید پتھر، وہ سفید کاغذ، سامنے کی الگنی پر والا سفید کوٹ لو۔ اور دوسری طرف محض سفیدی یا اسی طرح ایک جانب اپنا لکھنے والا ڈیڑھ گز کا لمبا مستطیل میز، اپنے ماتھ کا پانچ والا قلم۔ ایک فٹ کا لمبا کاغذ چیر لکھ رہے ہو، رکھو، اور دوسری جانب صرف لمبائی۔ ان میں ثانی الذکر یعنی سفیدی، لمبائی۔ یا اسی قبیل کے لفظوں کو ”مجردات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اول الذکر کو ”مولفات“ کہہ سکتے ہو۔

اب تقسیم اول کے پہلے قسم میں مثال کے طور پر تاج محل لو۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ خاص عمارت ہے جو اگرہ میں جناب واقع ہے جبکی کرسی ۲۸ فٹ بلند ۳۱۳ فٹ مربع ہے، جسکے چاروں گوشوں پر ۳۱۳ فٹ کے اونچے مینار ہیں۔ وسط میں ۱۸۶ فٹ مربع گہری مقبرہ ہے۔ یہ ساری عمارت سفید سنگ مرمر کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن نفس لفظ عمارت کے معنی میں نہ تو مربع ہونے کی تخصیص ہے نہ مستطیل، نہ مدور۔ نہ مثلث۔ نہ سنگ مرمر کی شرط ہے۔ نہ سنگ موسیٰ کی نہ اینٹ کی، نہ لکڑی کی نہ مٹی کی۔ یہی حال اوقیود کا ہے، یا یون کو کہ یہ لفظ بولکر ہم یورپ، ایشیا۔ افریقہ۔ امریکہ ٹھہریا

کہیں کا کوئی مکان کسی شکل، کسی مصالح، کسی ضرورت کسی حیثیت کا بنا ہو سب کو یکساں طور پر مراد لے سکتے ہیں، ان مرادی معنوں کا نام علی الترتیب ”مفہوم جزئی“ اور ”مفہوم کلی“ رکھ لو۔ یہ ان دو مختلف قسم کے لفظوں کی مراد یا مفہوم کا وہ معمولی فرق ہے جس کی بنا پر ہم اپنی روزانہ زندگی میں انکو دو مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس مراد استعمال میں عامی اور فلسفی سب برابر ہیں، نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔

اصل بحث یہ ہے کہ ان مختلف المراد لفظوں سے ذہن میں مختلف تصورات کیا پیدا ہوتے ہیں؟ اگر تم نے خود تاج محل کو دیکھا ہے، تو جہوت اس کا تصور ذہن میں باندھنا چاہو گے، تمہارے ملاحظہ اور یادداشت کے درجہ کے مطابق اسکی دھندلی یا صاف تصویر ذہن کے سامنے کھینچ جائیگی ورنہ اگر تم نے اسکی نقل و تصویر دیکھی ہے، یا صرف تھوڑا بہت حال سنا ہے، تو متخیلہ ایک تصویر تیار کر دینگا۔ جو اصل سے بہت سی باتوں میں مختلف ہونے پر بھی مجموعاً اس سے بہت کچھ شبابہ ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ اسی طرح اگر ہم لفظ عمارت سے کوئی تصور باندھنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ آبادہ نوع عمارت کے تمام ممکن الوجود افراد جزئیہ کے ماہ الاشتراکات کی ایک ایسی جامع مانع متعین تصویر ذہنی ہوگی جو گذشتہ موجودہ، آئندہ، تمام خاص خاص عمارت کو محتوی ہوگی (اگر ذہن کلیات کی کوئی ایسی شخص تصویر کھینچ سکتا ہے تو اسی کا نام تصور کلی ہے جو اس مضمون کا عنوان ہے) یا وہ کسی ایک خاص فرد عمارت کا تصور مع اپنے تمام جزئی خصوصیات کے ہوگا لیکن ذہن یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ خصوصیات عمارت کی حقیقت نوعی میں داخل نہیں۔ پہلے نظریہ کا اصطلاحی نام تصویرت ہے جو برکے کے قریباً تمام پیشرو فلاسفہ کا مذہب ہے اور دوسرا اسمیت کے نام سے مشہور ہے جو خود برکے اور اس کے اتباع کا مذہب ہے۔

یہاں تک تم نے تصور کلی کی حقیقت متعارف اچھی طرح سمجھ لی، اب ہم تصور مجرد کی کیفیت

توضیح کرتے ہیں۔ گو میرے نزدیک مجرد اور کلی الفاظ میں کوئی خاص معنوی فرق نہیں لیکن علی العموم الفاظ کی تقسیم کی جاتی ہے اور موجودہ بحث پر اس تقسیم کی صحت و قبح کا کوئی اثر نہیں اس لیے یہاں اس قضیہ کا چھیڑنا بے محل ہے۔ اوپر مجردات کی مثالیں سفیدی اور لمبائی بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح مکانیت۔ شجرتیت۔ انسانیت۔ مثلثیت۔ مربعیت۔ وغیرہ سب اسکی مثالیں بن سکتی ہیں۔ تمہارے سامنے سفید چہرہ کا ایک مربع میز رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میز کا جزئی تصور چہرہ سفید۔ اور مربع وغیرہ متعدد چیزوں سے مرکب ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کیا ذہن کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس میز کے تمام اور جزئیات اور خصوصیات کو چھوڑ کر محض سفیدی، محض مربع پن، یا محض حجریت کا متعین تصور قائم کر سکے اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو بس یہی ”تصور مجرد“ ہے۔ تصور مجرد کا فرق پوری طرح ذہن نشین رکھنے کے بعد یہ بالکل صاف ہے کہ مفہوم کلی اور مفہوم مجرد کوئی بحث اور اختلاف کی شے نہیں، کیونکہ اس سے کون انکار کرے گا کہ ”انسان“ بولکر کوئی خاص فرد، زید، عمر وغیرہ نہیں مراد لیا جاتا، بلکہ نوع انسان کے تمام افراد۔ اور لمبائی سے کسی خاص شے قطب مینار۔ یا اہرام مصری کی لمبائی نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ ہر مقدار والی شے کی لمبائی، مان جس چیز میں جھگڑا ہے، وہ کلیات و مجردات کا مفہوم نہیں، بلکہ تصور ہے۔ یعنی یہ کہ کلی یا مجرد الفاظ کا ذہن میں کوئی ایسا ہی وسیع اور تشخص مصداق ہوتا ہے۔

لیکن میرے نزدیک ذرا سوچنے کے بعد تصور کلی یا مجرد کا ناممکن الوجود ہونا اتنا ہی صاف ہے جتنا مفہوم مجرد یا کلی کا ناقابل نزاع ہونا۔ بلکہ اس سے زیادہ۔ کیونکہ اگر تم انسان کا تصور اپنے ذہن میں باندھنا چاہو تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ آدمی کی ایک ایسی ذہنی تصویر ہو جس کا رنگ نہ گورا ہو۔ نہ کالا۔ نہ سادہ۔ نہ کوئی اور۔ اسکا نقشہ نہ چینی ہو۔ نہ عربی، نہ ہندی، نہ مصری۔ نہ فرنگی نہ کسی اور ملک کا۔ اس کا قد نہ دراز ہو۔ نہ میانہ۔ نہ پست۔ اس کا لباس نہ انگریزی ہو نہ جاپانی

نہ ترکی، نہ افغانی، نہ عیانی، وہ نہ عورت ہو، نہ مرد، نہ بچہ، نہ بوڑھا، نہ جوان۔ اور پھر سب کچھ ہو۔
 دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ہزاروں اضداد و نقایض کے رفع و اجتماع کا ہیولی ہو۔ مین
 نہیں جانتا کہ زمین کا بسنے والا آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکتا
 ہو۔ یہی حال مجردات کا ہے، ذرا توجہ سے غور کرو کہ کیا سفیدی کا کوئی ایسا منظرہ تصور تمہارے ذہن
 میں آ سکتا ہو جو نہ برف کی سفیدی ہو، نہ روئی کی، نہ سنگ مرمر کی، نہ چمن کی، نہ سیپ کی، نہ ہلکی، نہ
 گہری، اور ساتھ سب کو شامل ہو۔ یا تمہارے ہاتھ میں سرخ رنگ چرٹے کا ایک گیند ہو تو کیا ذہن کے
 لیے یہ ممکن ہو کہ رنگ وغیرہ کے تمام خصوصیات کو چھوڑ کر صرف گولائی کا تصور قائم کر سکے؟ یقیناً معمولی
 تامل کے بعد ہر شخص ان سوالات کا جواب نفی میں دینگا۔

ایک شبہ یا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ذہن مجرد یا کلی تصور قائم کرنے سے عاجز ہے تو پھر
 احکام کلیہ کا تعلق کیا محض کلی الفاظ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ خارج میں کسی کلی کا وجود نہیں
 مثلاً جب یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ مثلث کے تینوں زاویے دو قائمون کے برابر ہیں، تو معلوم
 ہے کہ یہاں کوئی خاص مساوی الساقین، مساوی الاضلاع، یا مختلف الاضلاع مثلث مراد
 نہیں۔ بلکہ بلا تخصیص ہر ایک مثلث، اور خارج میں جو مثلث ہو گا وہ ان تمام قیدوں سے معرا
 نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس حکم کے لیے صرف لفظ مثلث، رہ جاتا ہے۔ جو کسی معنوی حقیقت کا محکوم علیہ
 نہیں بن سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ احکام کلیہ کا محکوم علیہ، نہ تو کوئی خارجی ہوتا ہے، نہ تصور ذہنی، نہ خود
 لفظ کلی، بلکہ الفاظ کلیہ یا مجردہ کے وہ معنی مرادی جنکا نام اوپر ”مفہوم کلی“ اور ”مفہوم مجرد“ رکھا ہے
 اب اپنی زیر اعتراض مثال میں دیکھو کہ مطلق مثلث بولکر مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک ایسی سطح، جو
 تین مستقیم خطوط سے گھری ہو۔ جو دوسرے لفظوں میں مثلث کی تعریف کہی جاتی ہے، اور

جس میں خطوط کی باہمی نسبت کا کوئی ذکر نہیں، بس یہی مراد استعمال مثلث سے متعلق تمام احکام کلیہ کا محکوم علیہ ہے، ایک کلیات و مجردات پر کیا موقوف ہر زبان میں سیکڑوں ایسے جزئی الفاظ موجود ہیں، جنکے مصداق کا نہ ذہن میں تصور ممکن ہے، نہ خارج میں کبھی حواس سے علم ہوا، لیکن وہ دن رات استعمال ہوتے ہیں۔ اور بیسیوں احکام کا محکوم علیہ بنتے ہیں۔ خدا، جبریل، شیطان، روح وغیرہ سب اسی طرح کے الفاظ ہیں کہ جن کے مصداق کا نہ کبھی حسی مشاہدہ ہوا، نہ ذہن میں ان کا کوئی واضح اور تعین تصور ہے۔ انکی نسبت ہم جو کچھ کہتے سنتے ہیں، اس کا تعلق صرف معنی مرادی سے ہوتا ہے۔ مثلاً تسکین کے نزدیک خدا سے مراد ایک ایسی غیر مادی ہستی ہے جو نہ زمین پر ہے، نہ آسمان پر۔ نہ مشرق میں نہ مغرب میں۔ نہ شمال میں۔ نہ جنوب میں جسکی نہ ابتداء ہے نہ انتہا، اس کے کان نہیں مگر وہ سنتا ہے، اس کے آنکھیں نہیں مگر وہ دیکھتا ہے۔ بتاؤ کیا تمہارے ذہن میں ایک آن کے لیے بھی ایسی ہستی کا تصور آسکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ پھر تم کہتے ہو کہ خدا رازق ہے، خالق ہے، قادر مطلق ہے۔ قمار ہے، بس معلوم ہوا کہ ان تمام صفات یا احکام کا تعلق، اُسی معنی مراد سے ہے، نہ کہ تصور ذہنی یا لفظ خدا سے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ عامی آدمی کے معنی مرادی ایک محکم اور فلسفی سے مختلف ہوں بلکہ ہوتے ہیں، ہندو کے بہت سے اصطلاحی الفاظ مثلاً نقطہ، خط، سطح وغیرہ بھی اسی صنف میں داخل ہیں، کون ذہن ایسے طول کا تصور کر سکتا ہے جس میں عرض اور عمق نہ ہو؛ لیکن خط ایسے ہی طول کا نام ہے، اور اس پر اقلیدس کے صدھا احکام جاری کیے جاتے ہیں کیا ان کا تعلق سوائے معنی مرادی کے کسی اور شے سے ممکن ہے۔ یہی حال نقطہ اور سطح کا ہے۔ اسکو بھی چھوڑ دو۔ تم کہتے ہو کہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ بتاؤ اس عالیٰ کا تعلق کس سے ہو؟ خارج میں اجتماع نقیضین کا وجود نہیں۔ ذہن اس کے مصداق کا تصور نہیں کر سکتا۔ لامحالہ حکم کا تعلق معنی مرادی سے ہے۔ یعنی کسی شے کا تمام حیثیات سے ایک ہی جگہ، ایک ہی وقت میں موجود ہونا

اور معدوم بھی ہونا۔

اسل یہ ہے کہ کلیات اور مجردات بھی ایک طرح کے اجتماع و ارتفاع مناقضات کا نام ہیں، اس لیے نہ خارج میں ان کا وجود ممکن ہے۔ نہ ذہن میں تصور، جب بہ وقت واحد انسان کے مفہوم میں حبشی اور رومی دونوں داخل ہیں۔ تو سیاہ سفید آدمی کا تصور اس سے زیادہ آسان نہیں جتنا مثلث مربع کا۔

اس میں شک نہیں کہ کلی اور مجرد الفاظ کے استعمال سے معنی مرادی کے ساتھ ساتھ کبھی ذہن میں متعین تصور بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ تصور ہمیشہ کسی ایک فرد جزئی یا یکے با دیگرے متعدد افراد جزئیہ ہی کا ہوتا ہے۔ فرض کرو جب تنے پہلے پہل الہ آباد کی نمائش یا کسی موقع پر ہوائی جہاز دیکھا ہوگا، تو جب ہوائی جہاز کا نام آتا ہوگا، تمہاری آنکھوں کے سامنے اُسی دیکھے ہوئے جہاز کا نقشہ پھر جاتا ہوگا، لیکن اگر گفتگو کا تعلق اس خاص جہاز سے نہ ہو تو تخیل کی بنا پر ذہن اس میں یوں تیسیم پیدا کر لیتا ہے، کہ یہ اور اس جیسے تمام دیکھے اور اُن دیکھے جہاز مراد ہیں۔ پھر جب ہم روزانہ اخبارات میں ہوائی تاخت کا حال پڑھتے ہیں تو تہود کی وجہ سے ذہن ہوائی جہاز کے صرف معنی مرادی پر قناعت کرتا ہے اور کسی جزئی جہاز کا تصور ذہن میں آنا لازمی نہیں ہوتا۔ اس طرح جب تم اول اول دیہات یا اپنے گھر سے بچپن میں ریل کے سفر کے لیے نکلے ہو گے، تو جہان تمہارے لیے ٹکٹ خرید گیا ہوگا اور ریل پر سوار ہو گے تو سنا ہوگا کہ لوگ اُس جگہ کو اسٹیشن کے نام سے پکارتے ہیں۔ چلتے چلتے پھر ایک جگہ ریل ٹھہری ہوگی اور بہت سے نئے مسافر سوار ہوئے ہوں، اور بہت سے اتر گئے ہوں گے۔ تمہارے ساتھیوں نے کہا ہوگا کہ یہ فلاں اسٹیشن ہے آخر ایک جگہ تم خود اتر پڑے ہو گے، اور اتنے تجربہ سے سمجھ لیا ہوگا کہ اسٹیشن سے مراد وہ جگہ ہوتی ہے جہاں ریل کچھ دیر ٹھہرتی ہے۔ پچھلے مسافر اترتے اور نئے سوار ہوتے ہیں، اب مطلق اسٹیشن کا نام

لیا جائیگا، تو شروع شروع میں اکثر اُس سے پہلے اسٹیشن کی تصویر تمہارے سامنے پھر جائے گی جہاں تم دیر تک ٹھہرے، سوار ہوئے، اور استلافات ذہنی کے قانون نے اُس کے تصور کو ذہن میں زیادہ راسخ کر دیا ہے۔ بار بار ایسا بھی ہوگا کہ دوسرے تیسرے اور چوتھے اسٹیشن کی بھی ایک دھندلی سی تصویر سامنے آجائے گی، لیکن ذہن ان جزئیات سے تمثیل کا کام لیتا ہے، باقی احکام کلیہ کا تعلق اسٹیشن کے اُسی معنی مرادی سے رکھتا ہے، جہاں ریل کتی اور مسافر چڑھتے اُترتے ہیں۔

ایک بات اور یاد رکھنے والی ہے۔ تم ایک عجائب خانہ میں جاتے ہو، جہاں آدمی کا ایک مردہ بچہ رکھا ہوتا ہے جسکے دوسرے ذہن میں دوسرے آدمی کا تصور نہیں ہوتا اور اس غیر معمولی مشاہدہ سے تملو بے انتہا حیرت ہوتی ہے۔ تاہم تم اس کو مانتی، گھوڑے، شیر، بکری وغیرہ کے بجائے آدمی ہی کا بچہ سمجھتے ہو، ہوتا یہ ہے کہ تمہارے خزانہ ذہن میں سیکڑوں ہزاروں تصورات جزئی پہلے سے جمع ہیں، اب جب اس نئے تصور کا ان تصورات سے موازنہ کرتے ہو تو شیر، بکری وغیرہ کی نسبت زید، عمر، بکیر، وغیرہ کے تصور سے یہ زیادہ اقرب وائشہ ہوتا ہے اس لیے بے تامل اس دوسرے بچہ کو تم انسان کی صف میں داخل کر دیتے ہو یہی حال ہر نئے تصور کا ہوتا ہے، کہ جس یکسانیت کی مدد سے اُسکو تصورات موجودہ کے مختلف اصناف میں سے کسی ایک صنف کا فرد قرار دے لیتے ہو۔ جس یکسانیت اور عمل موازنہ وضع کلیات کا اصلی سرچشمہ ہے۔ اب ہم اصل بحث کو اس درخواست پر ختم کرتے ہیں کہ ہمارے فیصلہ کے سقم و صحت کی جانچ کے لیے قارئین کو منطقی دلائل سے زیادہ، خود اپنے واردات ذہنی کا ذہنی مطالعہ کرنا چاہیے۔

سلسلہ برکے

اس سلسلہ میں تین کتابیں داخل ہیں
”برکے“

اس مجموعہ میں برکے کے سوانح، اسکی فلسفیانہ تصنیفات کی ناقدانہ تلخیص اور اس کے
فلسفہ تصورات کی تشریح و تنقید ہے، از پروفیسر عبدالباری ندوی، قیمت پیڑ
”مبادی علم انسانی“

برکے کی سب سے معرکہ آرا کتاب ”پرنسپلس آف ہیومن نالج“ کا ترجمہ، جس میں
مادیت کا ابطال ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ”ذہن سے باہر مادہ کا کوئی وجود نہیں“
از پروفیسر عبدالباری ندوی، قیمت پیڑ

”مکالمات برکے“

برکے کے ”ڈائلگس“ کا ترجمہ جس میں مکالمہ کی صورت میں برکے نے اپنے خاص
فلسفہ کی تشریح کی ہے۔ از مولوی عبدالماجد بی۔ اے۔ زیر طبع، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ،
منیجر

دار المصنفین اعظم گڑھ

برکطے - ع

۱۹۲۳

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیواہ لیا جائیگا۔

